لامذہبیت

تالیف: الدکتور محمد سعید رمضان البوطیؒ

مترجم: مولانا محمد وسیم میواتی صاحب دامت برکاتھم العالیہ

فہرست مضامین

عرضِ مترجم 8
مقدمہ مترجم 9
نئی اشاعت کا مقدمہ 11
دوسری اشاعت کا مقدمہ 14
تَعصب وجہالت کے دَرمیان راہِ اعتدال 15
کتاب پر حوصلہ کن اور حوصلہ شکن ردِ عمل 16
مثلاً خجندی کا یہ کہنا کہ: 23
مصنف کے والد کا پیش کلمہ 30
پہلی اشاعت کا مقدمہ اس رسالے کے اوراق کے پس منظر میں 32
رسالہ خجندی میں مذکور مباحث کا خلاصہ 39
وہ امور جن میں اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں۔ 47
پہلی بات یہ ہے کہ: 47
دوسری بات یہ ہے کہ: 48
تیسری بات یہ ہے کہ: 49
لوگوں کے اس رویے کی دو بنیادی وجوہات ہیں: 51
صاحب رسالہ کے نئے دعوے ان کے دلائل اور ان کا مدلل رد 53
مصنفِ رسالہ کی پہلی دلیل: 54

مذاہب دراصل اہلِ علم کی آراء اور ان کے بعض مسائل میں اجتہادات ہیں اور ان آراء و اجتہادات کی پیروی کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے کسی پر کوئی وجوب نہیں رکھا، کیا یہ وہی بات نہیں جو اسلام کے دشمن مشہور جرمن مستشرق شاخت نے ضد اور عناد کے ساتھ کہی تھی؟ 56
مصنفِ کتابچہ کی دوسری دلیل 60
تیسری دلیل 63
قبر میں انسان سے کسی مذہب یا طریق کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ (ص ۱۰) 63
چوتھی دلیل: 66
صاحبِ رسالہ کی پانچویں دلیل 69
عزبن عبد السلامؒ کے کلام کی حقیقت اور خجندی کا دیا گیا مُغالطہ: 70
عوام اور مجتہدین میں فرق: 70
پھر امام عزبن عبد السلامؒ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ: 71
صحابہؓ اور تابعین کا طرزِ عمل 71
اب آیئے دیکھتے ہیں کہ امام ابن القیمؒ نے اس موضوع پر کیا فرمایا: 73
ترجیحِ ابن القیمؒ: 81
تقلیدِ عالم اور حدودِ اجتہاد 82
زندہ و فوت شدہ مجتہد کی تقلید 82
محض کتبِ حدیث سے اجتہاد کا وہم 83
ابنِ قیمؒ کے متعصب پیروکاروں کا طرزِ عمل 83
حافظ ابنِ قیمؒ کے کلام کا سیاق اور منکرینِ تقلید کی غلط فہمی 84
مجتہد کے بعد مقلدین کے لیے راہِ عمل 87

ائمہ اربعہ کی تقلید پر اجماع 88
علامہ کمال ابن الہمامؒ کا منہجِ تقلید 89
منکرِ تقلید خجندی کی علمی یتیمی 90
ابن امیر الحاج اور ابن القیم کی ہم آہنگی 90
خجندی کی چھٹی دلیل: 91
دعویٰ خجندی کا رد و علمی محاسبہ 91
ائمہ اربعہ کا علمی مقام اور فقہی منہج کا امتزاج 94
خلاصہِ خلدون و مُغالطہِ خجندی 95
صاحبِ کراس خجندی کی ساتویں دلیل 96
تقلید سے مفر ممکن نہیں اور نہ کسی معیّن مذہب کی پیروی میں کوئی قباحت ہے 100
مثبت اور مضبوط دلائل کی ضرورت 101
صاحبِ رسالہ (خجندی) کے دو متضاد دعوے 101
تقلید کی حقیقت و مشروعیت 103
اجتہاد نہ کرنے والے کے لیے تقلید کی مشروعیت کا سوال 104
قرآنِ کریم سے دوسری دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 105
رسولِ اکرم ﷺ کی عملی تائید 106
عہدِ صحابہ میں افتاء و تقلید کا نظام 108
عہدِ تابعین میں اجتہاد کا پھیلاؤ 108
مکتبِ رائے (فقہِ عراق) کے ائمہ و متبعین 109
مکتبِ حدیث (فقہِ حجاز) کے ائمہ و متبعین 109

ائمہ کے باہمی مناقشات اور عوام کا طرزِ عمل 110
تیسرا پہلو: عقلی دلیل 112
تحقیقِ دلائل کا راستہ ہر شخص کے لیے ناممکن ہے 113
چاروں فقہی مذاہب کو بدعت قرار دینا علمی مغالطہ ہے 115
صرف مقلدینِ ائمہ پر بدعت کا طعن ایک بے اساس الزام 115
اہلِ رائے و اہلِ حدیث کے درمیان اعتدال کا قیام 116
ائمہ اربعہ کے مذاہب کی بنیاد کتاب، سنت اور اجماع پر ہے 116
منکرینِ تقلید کے دعوے بے بنیاد اور غیر علمی 117
امام ذہبیؒ کی شہادت اور اس کا وزن 126
تقلیدِ امام والتزامِ مذہب کا صحیح مفہوم 128
درجاتِ فہم اور تقلید کا علمی اصول 131
امام کے ترکِ حدیث کے اسباب 136
اگر تمام لوگ لامذہبیت کی وادی میں بہہ جائیں تو کیا ہو گا؟ 137
جامع فقہی میراث 139
بے لگام اجتہاد کے خطرات 139
عقل پرستی کا مغالطہ 140
بعض لامذہبی افراد کے ساتھ ہونے والی علمی بحث و مناقشے کا خلاصہ 148
اور اب بعد از کلامِ گزشتہ 164
ردِّ مخالفین کا علمی محاکمہ 168
مخالفین کا طرزِ خطاب 169

کتاب کے آغاز پر اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہونا۔ 170
کتاب کے مؤلفین اور تصنیف کی حقیقت 171
مصنفین کا مجھ پر الزام اور اسکی حقیقت 172
حوالہ امامِ غزالی بر شروطِ اجتہاد 172
المعصومی کا موقف اور استدلال 173
قولِ غزالیؒ اور مصنفین کی تضاد بیانی 173
الزام اور حقیقت: 174
عوام، مجتہد اور ان کے مقلدین 174
امامِ شاطبیؒ کی عبارت اور تحریف کی ایک نئی مثال 175
تحریف کا نتیجہ اور مجھ پر طنز 177
تقلید اور عقائد میں ناصر البانی کی انوکھی رائے 177
دلائل ظنی و قطعی کی بحث 178
شیخ ناصر کا دعویٰ اور اس کا عقلی رد 179
دائرہِ بحث واختلافِ اجتہادات 184
مذاہب اربعہ پر تجرباتی مطالعہ 185
مصنفِ بوطی پر الزام اور اسکی حقیقت 185
مفتی اور عالم کے درمیان فرق 185
باطل فرقوں کے درمیان اہلِ حق کی پہچان 191
جماعت اور سوادِ اعظم 193
امام شافعیؒ کے اس قول کا مفہوم کہ جب کوئی صحیح حدیث ہو تو 194

کیا مذاہبِ اربعہ کے درمیان تعصب ہے؟ 195
آئمۂ دین کی تنقیص پر سخت تنبیہ 197
علماء وائمہ کی عزت اور ان پر زبان درازی کی وعید 199
امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے کلام میں نہایت خطرناک اور مکارانہ تحریف 200
دہلویؒ کا اصل موقف اور ابنِ حزمؒ کے حوالے کی حقیقت 202
مصنفین کا یہ دعوی کہ ہم نے امام ذہبیؒ کے کلام----- 205
اس مناقشے پر مصنفین کا تبصرہ جو میرے اور شیخ ناصر الدین البانی کے درمیان ہوا 211

عرضِ مترجم

سب سے پہلے میں اپنے رب العالمین کا دل بے حد شکر ادا کرتا ہوں، جس کے فضل، رحمت اور توفیق سے یہ علمی خدمت پایہ تکمیل تک پہنچی، حقیقت یہ ہے کہ اسی کی عنایت نے قلم کو حرکت بخشی، خیالات کو ترتیب عطا فرمائی اور ہر دشوار مرحلے کو آسان فرمایا، اس کتاب کے اردو ترجمے کا خیال اُس وقت دل میں پیدا ہوا جب چند مخلص احباب نے خواہش ظاہر کی کہ یہ علمی و فکری خزانہ اردو زبان میں بھی دستیاب ہونا چاہیے اگرچہ تدریسی مصروفیات، گھریلو ذمہ داریاں اور مسائلِ افتاء کی نزاکتیں وقت کو گھیرے رکھتی ہیں، لیکن کتاب کے مطالعے کے بعد یہ احساس مزید پختہ ہو گیا کہ یہ تصنیف علم و بصیرت کا ایسا سرمایہ ہے جس سے اردو خواں طبقے کو بھی ضرور مستفید ہونا چاہیے۔ میں "النعمان سوشل میڈیا" ٹیم کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس علمی سفر میں خلوص، محبت اور بھرپور تعاون کے ساتھ میرا ساتھ دیا، اسی طرح اپنے اساتذۂ کرام کا بھی ممنون ہوں، جن کی تربیت، دعائیں اور علمی رہنمائی میرے لیے سرمایۂ افتخار اور باعثِ سعادت ہیں۔ اپنے والدین کا ذکر کیے بغیر یہ کلمات ادھورے رہیں گے، جن کی دعائیں، شفقت اور اخلاقی تربیت میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں انہی کی محبت اور تربیت نے علم کی راہوں پر ثابت قدم رہنے کا حوصلہ عطا کیا۔ خصوصی طور پر اپنی نقیہ، تقیہ اہلیہ محترمہ بنتِ علی محمد کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے نہ صرف حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ علمی معاونت، صبر، محبت اور فکری رہنمائی کے ذریعے ہر مرحلے میں میرا بھرپور ساتھ دیا ان کی علمی بصیرت اور مخلص رفاقت نے اس علمی سفر کو سہل اور پُر سکون بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ رب العزت اس معمولی کاوش کو قبولیت اور خیر کے ساتھ ہمکنار فرمائے۔

والسلام محمد وسیم میواتی

مقدمہ مترجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام تعریفیں اللہ ربّ العالمین کے لیے ہیں، جس نے علم کو ہدایت کا نور بنایا اور اہلِ علم کو امت کی رہنمائی کا ذریعہ فرمایا، درود و سلام ہوں سیدنا محمد ﷺ پر، جو سراپا رحمت و ہدایت ہیں اور آپ کے اصحاب پر جو ہدایت کے مینارے ہیں، اسلام محض چند عبادات کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اور اس جامع نظام کو سمجھنے، محفوظ رکھنے اور امت تک پہنچانے میں فقہاء، محدثین، مفسرین اور اصولیین نے عظیم خدمات انجام دی ہیں، انہی خدمات کا ایک روشن باب فقہی مذاہب ہیں، جنہوں نے صدیوں تک امت کی علمی وحدت، فقہی استقامت اور عملی رہنمائی کو محفوظ رکھا۔

زیرِ نظر کتاب عظیم محقق و مفکر علامہ الشیخ ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق تصنیف «اللامذہبیة أخطر بدعة تهدد الشريعة الاسلامية» کا اردو ترجمہ ہے۔ علامہ بوطی رحمہ اللہ اپنے دور کے ممتاز عالم، مفکر، خطیب اور مصنف تھے، جنہوں نے اعتدال، علمی وقار اور مضبوط دلائل کے ساتھ امت کی فکری رہنمائی فرمائی، آپ نے فقہ، عقیدہ، تصوف اور معاصر مسائل پر ساٹھ سے زائد علمی آثار چھوڑے۔ یہ کتاب دراصل اُن افکار کے رد میں لکھی گئی ہے جو فقہی مذاہب اور تقلیدِ ائمہ کو غیر ضروری قرار دے کر عوام کو براہِ راست نصوص سے استنباط کی دعوت دیتے ہیں۔ علامہ بوطی رحمہ اللہ نے نہایت مدلل اور اصولی انداز میں واضح کیا کہ اجتہاد و تقلید امت کے علمی نظام کا لازمی حصہ ہیں، اور لامذہبیت درحقیقت فقہی انتشار اور فکری بے راہ روی کا دروازہ کھولتی ہے۔

کتاب میں تقلید کی شرعی حیثیت، فقہی مذاہب کی تاریخی اہمیت، اجتہاد کے اصول، اور منکرینِ تقلید کے شبہات کا علمی و تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس کے ساتھ مصنف نے علمی اختلاف میں اعتدال، اخلاق اور

حکمت کے اسلوب کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالٰی اس اردو ترجمہ کو علماء و طلبہ، اہلِ مطالعہ اور عام قارئین کے لیے مفید اور فقہی اعتدال و علمی بصیرت کے فروغ کا ذریعہ بنے گا۔

والسلام: محمد وسیم میواتی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمام تعریفیں اُس خدا کے لیے ہیں جو اپنے بندوں پر بے شُمار نعمتیں اور اِنعامات نازل فرماتا ہے، اور درود و سلام ہے اُس کے برگزیدہ نبی حضرت محمد ﷺ پر، جن کے ذریعے ہدایت کا چراغ روشن ہوا، اور اُن کے پاکیزہ اہلِ بیت، اصحابِ کرام، اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والے تابعین پر، تا روزِ قیامت،

اے ربِّ کریم ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تُو مجھے میرے نفس کے سپرد کر دے، چاہے وہ علم کے معاملے میں ہو یا طلبِ علم کے سفر میں، اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میری تحریر یا میری گفتار کا محرک نفس کی کوئی خفیہ خواہش بن جائے، یا شیطان کے القا کردہ تعصب اور ضد کا سایہ مجھ پر طاری ہو،

اے ارحم الراحمین ! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تُو ہمارے اور ہمارے دینی بھائیوں کے درمیان ایسا حق و انصاف پر مبنی فیصلہ فرما جو تیرے خاص فضل و کرم سے ہو، ایسا فیصلہ جو دلوں سے خواہشات و وساوس کے پردے ہٹا دے، اور نگاہوں سے شک و شبہ کی دھند کو مٹا دے، اور میں تیرے حضور عاجزی و اِنکساری سے دعا کرتا ہوں کہ تُو ہمیں اخلاص کی وہ نعمت عطا فرما جس کے ذریعے ہمارا ہر اِرادہ، ہر کوشش، اور ہر تحریر محض تیری رضا کے حصول کے لیے ہو، نہ کہ کسی دنیاوی غرض، نفس کی لذت، یا رائے کی برتری کے لیے، بے شک تُو ہی بڑا رحیم ہے، اور تیرے سوا کوئی پناہ دینے والا نہیں۔

نئی اشاعت کا مقدمہ

اب یہ کتاب اپنی ایک خصوصی اور منقح اِشاعت کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے، جس میں عبارت کی نئی ترتیب اور بہتر تنسیق کا اہتمام کیا گیا ہے، اس سے قبل بھی یہ کتاب دسیوں بار طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہے، اور اس تمام عرصے میں۔ میں نے دوسری اشاعت کے مقدمے میں کوئی اضافہ ضروری نہیں سمجھا، تاہم

اب جبکہ یہ نئی اشاعت اس کتاب کی سامنے آ رہی ہے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ چند باتیں بطور وضاحت عرض کر دوں، حق کی بات کو علمی منطق اور مہذب اسلوب کے ساتھ پیش کرنا اور اِسے شخصی حملوں، طعن و تشنیع یا دل آزاری سے پاک رکھنا ہر اُس شخص کا فرض ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اِس کی توفیق اور اِستعداد عطا فرمائی ہو، یہی وہ ذمہ داری ہے جس کی طرف قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، یقیناً یہی لوگ حقیقی کامیاب ہیں۔ (سورۃ آل عمران، آیت 104)

البتہ اگر یہ علمی گفتگو آگے چل کر ذاتی مناظروں، مسلسل جوابی تحریروں اور تلخ وتُند جملوں کی صورت اختیار کر لیں جہاں مقصد دل کی بھڑاس نکالنا یا اپنی ذات کا دفاع کرنا رہ جائے تو یہ دراصل وہ غیر ضروری جدال و مناقشہ ہے جس سے شریعت نے ہمیں منع فرمایا ہے، اور اللہ کی پناہ کہ ایسا طرزِ عمل بیانِ حق یا اِس مبارک آیت کے مفہوم میں شُمار کیا جائے، رہا حق کا بیان تو وہ وہی ہے جس کی توفیق اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کتاب کی بحثوں اور تحقیقی مباحث میں عطا فرمائی ہے، لہٰذا مجھے صرف امید ہی نہیں بلکہ یقینِ کامل ہے کہ جب تک لوگوں کو اِس کتاب کی ضرورت پڑتی رہے گی، یہ کتاب اللہ کے فضل و کرم سے (انشاءاللہ) بار بار طبع ہو کر اپنے مقصد کی خدمت انجام دیتی رہے گی۔ اور جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جنہیں جب اس بیانِ حق کی وضاحت ناگوار گزری، تو اُنہوں نے سب و شتم اور بد کلامی کا راستہ اختیار کیا، اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے زبانوں سے ایسے سخت اور ناشائستہ الفاظ استعمال کیے جو دلوں کو زخمی کر دیتے ہیں، مگر میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ خدانخواستہ میں بھی کبھی کسی ایسے طرزِ عمل میں ملوث ہو جاؤں یا اس لغزش میں پھنس جاؤں، حق کو اس دائرے میں رہتے ہوئے واضح کرنا جس کی وضاحت ناگزیر ہو درحقیقت اُن اہم ترین اسباب میں سے ہے جو امتِ مسلمہ کے اتحاد، دلوں کے اتصال اور صحیح شعور و فہم کے استحکام کا ذریعہ بنتے ہیں، اور یہی وہ کام ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق عطا فرمائی، اور میں نے اِسی مقصد کے لیے قلم اٹھایا، لیکن ضد، ہٹ دھرمی، جھگڑوں میں پڑنا، اور ناشائستہ کلام کا جواب ویسی ہی سخت بات سے دینا، یہ سب وہ خطرناک اَسباب ہیں جو اُمت

کے شیرازے کو بکھیر دیتے ہیں، صفوں میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں، اور دلوں کے درمیان نَفرت و فاصلے بڑھاتے ہیں، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ رب العزت مجھے ان سے محفوظ اور ایسی ہر گفتگو یا روش سے دور رکھے،اس کے ساتھ میں اس ذاتِ بابرکت سے یہ بھی سوال کرتا ہوں کہ وہ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی کینہ یا بغض نہ رکھے، ہم سب کو اپنے سیدھے اور مضبوط راستے پر جمع فرمائے،اور ہماری زندگی کا اِختتام اپنی رضا وخوشنودی پر کرے۔ تمام حمد وثنا اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے۔

دمشق 1: شعبان ۱۴۰۵ھ

۲۱ اپریل ۱۹۸۵ء

محمد سعید رمضان البوطیؒ

دوسری اشاعت کا مقدمہ

میں نے اس رسالے کی تجدیدِ اشاعت کے بارے میں طویل عرصہ تک تردد کیا، بار بار اپنے دل سے سوال کرتا رہا کہ : کیا میں نے اس کتاب کی اِشاعت کے ذریعے اُمتِ مسلمہ کے اتحاد کی رَسی میں کوئی گرہ تو نہیں ڈال دی؟ کیا کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ میری تحریر نے بجائے اِصلاح کے اِختلاف کی کوئی لہر پیدا کر دی ہو؟ میں سوچتا رہا کیا میرے کسی جُملے میں کسی شخص کے لیے کوئی ذاتی اِشارہ، کوئی دل آزار لفظ یا ناگواری کا پہلو تو نہیں؟ کیا میرے کلام کا کوئی حصہ اس علمی گفتگو کی بلند چوٹی سے پھسل کر ایسے جھگڑالو مناظرانہ اسلوب میں تو نہیں جا پڑا جو قلوب میں نفرت اور اَذھان میں غبار پیدا کرے اور جو شبہات کو رفع کرنے کے بجائے انہیں گہرا دے؟ چنانچہ میں نے اپنے قلم سے نکلی ہوئی ہر سطر کو پلٹ کر دیکھا، کبھی خود کو مخالف کی جگہ رکھ کر تو کبھی ایک ایسے قاری کی نظر سے جو ہر تعصب سے پاک اور ذہناً خالی ہو، میں نے ہر لفظ کو تول کر دیکھا، ہر جملے کو پرکھا پھر مطمئن دل سے کہہ سکا کہ :الحمد للہ !

میں نے اپنی کسی تحریر میں کسی شخص کی اہانت یا دل آزاری نہیں کی، میری تحریر میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں جو کسی کی حرمت پر دست درازی کرے یا علمی شرافت سے گری ہوئی طنز و تمسخر کی بو دیتا ہو، پھر میرے دل نے دوسرا سوال اٹھایا کہ : ممکن ہے کہ اس کتاب کے شائع ہونے سے امت کی وحدت پر کوئی اثر پڑا ہو؟ تو میں نے قارئین کے خطوط، آراء اور تبصرے دیکھے مختلف طبقات و مذاہبِ فکر سے تعلق رکھنے والوں کے تاثرات سنے جو میری اس کتاب سے متعلق تھے، تمام خطوط اور تبصروں کو پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ بحمد اللہ اس کتاب نے نہ کسی صف میں دراڑ ڈالی، نہ کسی رشتے کو کمزور کیا، اور نہ ہی کسی اتفاق کو توڑا، بلکہ معاملہ تو اس کے برعکس نکلا، اس کے شائع ہونے سے دو متضاد مگر خیر خواہ اثرات سامنے آئے جو بالآخر ایک ہی نتیجے پر جا ملے : بہت سے منتشر اذہان اور پراگندہ دل اعتدال کی ایک ایسی راہ پر جمع ہو گئے جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط، بلکہ اعتدال ہے۔

تعصب و جہالت کے درمیان راہِ اعتدال

دینی طبقے میں کچھ لوگ ایسے تھے جو ائمہ اربعہ کی تقلید میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ ان کا طرزِ عمل عصبیت اور بدعت کی آمیزش سے خالی نہ رہا، اگر وہ شافعی ہوتے تو حنفی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کو گوارانہ کرتے، اور اگر کسی مسئلے میں قرآن و سنت کے دلائل اپنے امام کے قول کے خلاف پاتے، تب بھی اپنے امام کے مسلک سے ہٹنے کو اپنے لیے روانہ سمجھتے، لیکن جب ان لوگوں نے اس موضوع پر میری تحریریں پڑھیں، تو ان کے دلوں میں ایک انقلاب پیدا ہوا، تعصب کی زنجیریں ڈھیلی پڑ گئیں، اور غور و تحقیق کی روح ان کے اندر بیدار ہوئی، یوں وہ رفتہ رفتہ تنگ نظری اور جمود سے نکل کر اعتدال و توازن کی راہ پر آ گئے، اسی طرح اہلِ علم میں ایک دوسرا گروہ بھی تھا جو جہالت کی انتہا تک پہنچا ہوا تھا، ان کا خیال تھا کہ ائمہ اربعہ گویا رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے مدِّ مقابل ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے ہٹا کر اپنی فقہی آراء کی طرف مبذول کریں، ان کا گمان تھا کہ جب تک ان ائمہ کے مذاہب کو بیچ سے ہٹایا نہ جائے، تب تک امت اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان سے یہ رکاوٹیں دور نہیں ہو سکتیں، مگر جب ان لوگوں نے بھی میری تحریریں پڑھیں، تو وہ اپنی اس سخت غلط فہمی اور خطرناک جہالت پر نادم ہوئے، انہیں احساس ہوا کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب دراصل وہ زینے ہیں جن کے ذریعے ہدایتِ نبوی تک پہنچا جا سکتا ہے، نہ کہ وہ دیواریں جو امت کو نبی ﷺ کی شریعت سے روکتی ہیں، یوں یہ دونوں انتہائیں ایک جانبِ تعصب میں ڈوبے مقلدین اور دوسری جانبِ جہالت میں بھٹکے منکرینِ تقلید آخر کار ایک دوسرے کے قریب آ گئے، اور سب کے سب میانہ روی، بصیرت اور راہِ استقامت پر جمع ہو گئے۔

کتاب پر حوصلہ کن اور حوصلہ شکن ردِ عمل

مجھے جو بے شمار خطوط موصول ہوئے اور جن مخلص اہلِ علم و بصیرت سے ملاقات کا موقع ملا، ان سب میں ان دونوں اصلاحی اثرات کی جھلک نمایاں نظر آئی، بہت سے وہ لوگ جو کبھی راہِ حق سے دائیں بائیں ہٹ گئے تھے، اب وہ اس سیدھی، کشادہ شاہراہ پر لوٹ آئے جس کی تلاش ہر سچے مسلمان کے دل میں ہوتی ہے، اب میں سوال کرتا ہوں: کیا میں نے اس عمل سے مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ پیدا کیا ہے؟ یا میں نے ان کے منتشر قلوب کو وحدت پر جمع کر دیا ہے؟ کیا میں نے انہیں حیرت و اختلاف کی تاریک راہوں میں دھکیل دیا ہے؟ یا انہیں وہاں سے نکال کر روشن بصیرت اور صحیح شعور کی جانب رہنمائی کی ہے؟ ہاں، یہ سچ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں میری تحریریں گراں گزریں، انہوں نے یہ سمجھا کہ ان میں مسلمانوں کے اتحاد اور ان کے عقیدے کے لیے خطرہ پوشیدہ ہے، یہاں تک کہ بعض نے اس کتاب کو پڑھنا ہی پسند نہ کیا، بلکہ پوری کوشش کی کہ یہ عوام تک نہ پہنچے اور عوام کو بھی اس کے مطالعے سے روک دیا جائے، واقعی، ایسے لوگ موجود تھے بلکہ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے کتاب کے بارے میں ایسے الفاظ کہے جن کا ذکر کرتے ہوئے قلم بھی شرماتا ہے، بعض نے مجھے جاہل کہا، کچھ نے جھوٹا اور من گھڑت باتیں بنانے والا، لیکن ان سب اعتراضات کے باوجود، میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ میری ان کوششوں کے نتیجے میں بہت سے منتشر اذہان مجتمع ہوئے، ان کے دلوں میں تحقیق و بصیرت کی روشنی پیدا ہوئی، اور ان کے سامنے وہ سیدھی راہ واضح ہو گئی جس پر ہمارے نیک اسلاف صدرِ اسلام سے لے کر آج تک ہمیشہ قائم رہے، اور جس سے وہ کبھی نہیں ہٹے۔

لیکن اِن (مخالفینِ ائمہ اربعہ) نے خود ہی کہا کہ یہ چاروں مذاہب دین میں ایک نئی ایجاد ہیں، جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ بعض نے تو ان عظیم ائمہ کی گراں قدر تصنیفات کو زنگ آلود کتابیں تک کہہ ڈالا، لیکن ان تمام بے بنیاد باتوں سے وہ روشن حقیقت کبھی نہیں بدلی، جسے ہر دور کے علما و صلحا نے پہچانا، اور

جس پر نسل در نسل امتِ مسلمہ کا اِتفاق رہا، اور وہ یہ کہ یہی چاروں مذاہب در حقیقت اسلام کا لبِ لباب اور اس کی روح ہیں، انہی کے ذریعے ہر زمانے کے مسلمانوں کو اپنے دین کے احکام کی پہچان ہوئی، اور انہی کی برکت سے کتابُ اللہ اور سنتِ رسول ﷺ پر عمل کا راستہ سہل و واضح ہوا، اب اگر ان کے نزدیک ائمہ اربعہ کے خلاف اس قدر جری اور ظالمانہ کلمات کہنا جائز ہے، تو میرے بارے میں جو انہی ائمہ کے مقام و مرتبہ کا دفاع کرتا ہے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ وہ مجھے جاہل، جھوٹا یا فریب کار کہیں، اور میری تصنیف کے بارے میں ایسے نازیبا الفاظ استعمال کریں جن کا ذکر زبان پر لانا بھی باعثِ شرم ہے، تاہم میں پھر کہتا ہوں کہ: کیا میں نے اپنی تحریر میں کسی پر ظلم کیا؟ کیا میں نے تحقیق و استدلال کے سوا کوئی غیر علمی بات لکھی؟ کیا میری تحریر نے مسلمانوں کو گمراہی اور تذبذب میں ڈالا، یا انہیں شک و شبہ سے نجات دلائی؟ اور کیا میرے لیے، جو ایک مسلمان ہونے کے ناطے ائمہ و علما کی خدمت پر فخر کرتا ہے، اور جس کے ہاتھ میں قلم کی امانت ہے، یہ مناسب تھا کہ میں خاموش رہتا جبکہ لوگوں کے ذہنوں پر وہم و شبہات کی گرد چھائی ہوئی تھی؟ کیا مجھ پر لازم نہ تھا کہ چند سطروں کے ذریعے ان غلط فہمیوں کے بادل چھانٹنے کی کوشش کرتا؟

اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ میں نے اس تحریر میں کسی پر تہمت نہیں لگائی نہ ہی کسی کے خلاف جھوٹ گھڑا ہے، میں نے جو کچھ قلم بند کیا ہے وہ سب کچھ حقیقت پر مبنی وہی گفتگو، وہی حالات ہیں جو میرے اور ان میں سے ایک صاحب (البانی) کے درمیان پیش آئے، میں نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی سوائے چند جملوں کے جو عام بول چال کی زبان میں تھے جنہیں محض فَصیح اور رَواں عربی انداز میں ڈھالا گیا ہے، تاہم اس سب کے بعد میرے دل میں یہ سوال پھر اُبھرا کہ:

کیا واقعی مسلمانوں کو اس رسالے کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت ہے؟ کیا وہ جو پہلے پڑھ چکے ہیں وہی ان کے لیے کافی نہیں؟ پہلے پہل میرا اطمینان بخش جواب یہی تھا کہ نہیں، کتاب کو دوبارہ چھاپنے کی کوئی حاجت نہیں، کیونکہ ہزاروں نسخے عوام کے درمیان تقسیم ہو چکے ہیں اور وہی ان کے لیے کافی اور وافی ہیں، مگر

جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ لوگ بڑی بے چینی سے اس کتاب کو تلاش کر رہے ہیں مجھے بتایا گیا کہ ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جس نے نہ اس کتاب کا نام سنا اور نہ ہی اس کتاب کے مضامین تک رسائی حاصل کر سکا، جب ان کی توجہ اس طرف ہوئی تب تک بازار سے تمام نسخے ختم ہو چکے تھے، اور اللہ کی قسم ! میں نے کبھی گمان بھی نہ کیا تھا کہ لوگ اس موضوع میں حق کو جاننے کے لیے اس قدر تڑپ اور اشتیاق کا مظاہرہ کریں گے، میں نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ مجھے اتنے مختلف اور کثیر خطوط موصول ہوں گے جن میں لکھنے والوں نے یہ اظہار کیا کہ ان کے دلوں کو اطمینان اور سکون ملا، اور ان کے سامنے وہ حقائق روشن ہو گئے جن میں پہلے ان پر باطل کا غبار چھا گیا تھا، اس کے بعد میں نے یہ حقیقت جانی کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد عرصے سے ان لوگوں کے دباؤ میں مبتلا ہے جو انہیں برابر یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ائمہ اربعہ اور ان کے مستند فقہی مذاہب سے اپنی نسبت ختم کر دو۔ اور ان عوام میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو یا تو بالکل سادہ لوح ہیں یا صرف علم کے ابتدائی درجے پر ہیں، جن کے پاس اتنی علمی بصیرت نہیں کہ وہ ان گمراہ کن افکار کا پردہ فاش کر سکیں، البتہ ان میں فطری اسلامی سادگی اور عقلی پاکیزگی ضرور ہے جو انہیں یہ محسوس کراتی ہے کہ یہ دعوت دل پر گراں، حق سے دور، اور باطل کے قریب ہے، اسی لیے ان کے دلوں میں یہ شدید خواہش جاگتی ہے کہ کوئی انہیں علم و انصاف کی روشنی میں دلائل کے ساتھ راہ دکھائے، یوں ان کے لیے ایک مختصر، جامع اور سادہ کتاب کی ضرورت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی جو انہیں اس اہم مسئلے میں رہنمائی فراہم کرے، لہٰذا لازم ہوا کہ مسلمانوں کی اس خواہش اور ضرورت کا احترام کیا جائے اور اس کتاب کو دوبارہ شائع کیا جائے، اور آج جب میں اس کتاب کے صفحات پلٹتا ہوں تو دل مطمئن ہے کہ کسی ایک سطر میں بھی تبدیلی کی ضرورت نہیں، نہ ہی کسی نئی بات کے اضافہ کی حاجت ہے، سوائے اس مقدمے اور چند توضیحی حاشیوں کے جو اس گفتگو کے نتیجے میں شامل کرنا مناسب ہوا جو میری اور شیخ ناصر الدین البانی کی ملاقات کے دوران اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے بعد ہوئی، اگر مجھے کسی طرف سے کوئی اعتراض یا وضاحت موصول ہوتی تو میں بلا تردد اس کی

اصلاح کرتا یا وضاحت پیش کرتا، مگر نہ ان حضرات میں سے کسی نے جو اپنے آپ کو ''حق کے مخالف'' سمجھتے ہیں، کوئی رد کیا، اور نہ ہی ان قارئین نے، جو اس کتاب کی دوبارہ اشاعت پر اصرار کر رہے تھے،[1]

کوئی سوال یا وضاحت طلب کی ہاں صرف اتنا ہوا کہ شیخ ناصر الدین البانی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم ملاقات کریں تاکہ وہ اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے اور تبصرہ براہِ راست پیش کر سکیں۔ چنانچہ یہ ملاقات عمل میں آئی، اور میں نے نہایت توجہ سے ان کی گفتگو اور نکات سنے، میں نے دیکھا کہ ان کی تمام باتیں دو نکات میں سمٹتی ہیں:

پہلا نکتہ یہ تھا کہ انہیں کتاب کا عنوان ''اللامذہبیہ: ایک ایسی خطرناک بدعت جو شریعتِ اسلامی کو درپیش ہے۔ انتہائی بڑا اور غیر متناسب محسوس ہوا ان کے خیال میں میں نے کتاب میں ایسا کوئی واضح ثبوت پیش نہیں کیا جو اس سنگین عنوان کے صحیح ہونے کی تصدیق کرے،

دوسرا نکتہ یہ تھا کہ میرے نزدیک میں نے 'الحجندی' کی کتاب کو صحیح طور پر سمجھا نہیں، جس کا جواب یہی میری کتاب ہے، شیخ ناصر کے نزدیک الحجندی نہ تو ائمہ کے فقہی مذاہب کا انکار کرتا ہے اور نہ ہی عام آدمی کے لیے تقلید کے جواز کو رد کرتا ہے، بلکہ وہ صرف ان لوگوں پر تنقید کرتا ہے جو ائمہ کے اقوال پر اندھی تقلید کرتے ہیں، دلیل کو چھوڑ کر محض شخصیت پرستی میں مبتلا ہیں، اور چونکہ یہ بات میرے اور اس کے درمیان متفق علیہ ہے، اس لیے ان کے خیال میں اس پر اتنی شدت اور سختی کی ضرورت نہ تھی، یہ تھیں وہ بنیادی گفتگوئیں اور مشاہدات جو تین گھنٹے کی طویل نشست میں شیخ ناصر نے میرے سامنے پیش کیے۔

(1) یہ مقدمہ اس وقت تحریر کیا گیا جب مجھے ابھی وہ کتاب نہیں ملی تھی جو حضرات شیخ ناصر الدین البانی، محمود مہدی الاستانبولی اور خیر الدین وانلی نے ''المذهبية التعصبية هي البدعة''، کے عنوان سے لکھی تھی، بعد میں جب وہ کتاب میرے ہاتھ لگی تو میں نے اس پر تبصرہ بطورِ ضمیمہ اسی کتاب کے آخر میں شامل کر دیا.

میں نے ان سے پہلی بات کے سلسلے میں عرض کیا کہ دراصل یہ پوری کتاب اپنے عنوان کی سچائی پر زندہ دلیل ہے، میری اس تصنیف کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ وہ مسلمان جو کتاب و سنت سے براہِ راست استنباط کی صلاحیت نہیں رکھتے خواہ وہ صحابہ کے بعد کے زمانے کے ہوں یا تابعین میں سے ان کا طریقہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ وہ ان ائمہ میں سے کسی ایک کے مذہب کی پیروی کریں جنہیں براہِ راست قرآن و سنت سے اخذ اَحکام کی اہلیت حاصل تھی، ایسے لوگوں کو اختیار ہے کہ اگر چاہیں تو کسی ایک امام کے مذہب پر قائم رہیں، اور اگر چاہیں تو کسی دوسرے امام کی طرف منتقل ہو جائیں،

یہی طرزِ عمل خیر القرون میں بھی رائج تھا، چنانچہ صحابہ کرام میں بہت سے حضرات ایسے تھے جن کے دل صرف حضرت ابن عباسؓ کے فتووں سے مطمئن ہوتے تھے، لہٰذا وہ اپنے سوالات کسی اور سے نہ پوچھتے، اور کسی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ کسی صحابی نے اس طرزِ التزام پر نکیر کی ہو، اسی طرح اہلِ عراق نے طویل عرصہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مذہب پر عمل کیا، خواہ ان کی ذات سے براہِ راست یا ان کے شاگردوں کے واسطے سے اور کسی عالم نے انہیں اس طرزِ عمل سے روکا نہیں، اسی طرح اہلِ حجاز بھی مدتوں تک حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ان کے تلامذہ اور اصحاب کے مذہب پر کاربند رہے، اور کسی صاحبِ علم نے اس طرزِ التزام کو بدعت یا ممنوع قرار نہیں دیا، پھر مکہ مکرمہ میں ایک عرصے تک صرف دو بزرگ، عطاء بن ابی رباحؒ اور مجاہدؒ ہی فتوے دیتے تھے، یہاں تک کہ خلیفہ وقت کا منادی اعلان کرتا کہ :

لوگو! تم میں سے کوئی شخص ان دو اماموں کے سوا کسی سے فتویٰ نہ لے، {یعنی، تقلیدِ شخصی} اور اس پورے دور میں نہ کسی عالمِ تابعی نے خلیفہ پر اعتراض کیا، نہ عوام پر کہ وہ دو مخصوص اہلِ علم کی تقلید کیوں کر رہے ہیں، تو بتایئے! ان تمام تاریخی شواہد کے بعد کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ کسی ایک امام کی تقلید حرام ہے؟ کیا یہ دعویٰ

دراصل ایسی بے بنیاد بدعت نہیں جس کی کوئی شرعی دلیل نہیں؟ اب ذرا سوچیے کیا ''لامذہبیت'' (اللامذھبیۃ)اس کے سوا کسی اور چیز کا نام ہے؟[1]

---

(1)۔یہ بات اپنے آپ میں اتنی واضح ہے کہ کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں،تاہم مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ: مذہبیت (المذھبیۃ)کا مطلب یہ ہے کہ عام شخص یا غیرِ مجتہد کسی مجتہد امام کی تقلید کرے چاہے ایک ہی امام پر قائم رہے یا بوقتِ ضرورت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتا رہے،اور لامذہبیت (اللامذھبیۃ) کا مطلب یہ ہے کہ عامی یا غیر مجتہد کسی بھی امام مجتہد کی تقلید نہ کرے،نہ بطورِ التزام،نہ بطورِ اختیار یہی مفہوم لغت میں بھی معروف ہے اور اصطلاح میں بھی یہی رائج ہے،اور عام لوگوں کی زبان پر بھی یہی سمجھا جاتا ہے،مثلاًاگر آپ کہیں کہ فلاں شخص''حزبی'' ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ کسی نہ کسی جماعت کا پابند ہے،خواہ ایک سے دوسری جماعت میں منتقل ہوتا رہے یا کسی ایک ہی سے وابستہ رہے،اور اگر آپ کہیں کہ وہ''غیرِ حزبی'' ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس کا کسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں،

مگر شیخ ناصر الدین البانی فرماتے ہیں کہ آج کل کے مسلمانوں کی نظر میں ''مذہبیت'' کا مطلب کچھ اور ہے،(دیکھیے: صفة صلاة النبي ﷺ، ص 232) میں حیران ہوں کہ یہ صاحب ہر بار یہ کیوں گمان کرتے ہیں کہ صرف وہی صحیح فہم رکھنے والے ہیں؟ جو وہ سمجھیں وہی تمام مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے،اور جو وہ نہ سمجھیں،سب کو اس سے انکار کرنا لازم ہے؟!اگر وہ ''مذہبیت'' اور ''لامذہبیت'' کے وہ معانی نہیں جانتے تھے جو میں نے وضاحت سے بیان کیے،تو کیا تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ان کے اس جہل میں ان کے شریک بن جائیں؟

شیخ ناصر مزید فرماتے ہیں کہ میں نے اس تعریف سے اپنی پوری کتاب ہی گرادی ہے،کیونکہ ان کے مطابق اگر میری تعریف درست مانی جائے تو سب لوگ ''مذہبی'' قرار پائیں گے،اور یوں میرا سارا موضوع محض ایک وہم پر قائم ہوگا،حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو جان لیتے کہ سلفیت سے نسبت رکھنے والے تمام لوگ اسی معنی میں مذہبی ہیں یعنی وہ کسی نہ کسی امام مجتہد کی آراء پر اعتماد کرتے ہیں،خواہ ایک ہی امام پر التزام کے ساتھ،یا مختلف ائمہ کے درمیان منتقل ہوتے ہوئے اگر وہ یہ حقیقت مان لیتے تو مجھے اس بحث کو تحریر کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔لیکن

افسوس کہ شیخ ناصر کا یہ کہنا حقیقت سے بہت دور ہے، جن لوگوں کو ہم راہِ اعتدال دکھانا چاہتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی امامِ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید قبول نہیں کرتا، بلکہ ہر ایک کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ براہِ راست قرآن وسنت سے حکم اخذ کرتا ہے، ہم نے خود دیکھا کہ ان میں اکثر لوگ علمِ دین سے بے بہرہ ہیں، مگر پھر بھی کسی امام کے فتوے کو اس وقت تک قبول نہیں کرتے جب تک ان کے سامنے اس امام کی دلیل، حدیث اور سند پیش نہ کر دی جائے، اور جب انہیں یہ سب بتایا جائے تو ایسے ناز وانداز سے گفتگو کرتے ہیں جیسے وہ خود محدثینِ کرام کے ہم پلہ ہوں! پھر یا تو وہ امام کے قول کو "درست" کہہ دیتے ہیں، یا گستاخی کے ساتھ اسے غلط اور "ضعیف" کہہ کر رد کر دیتے ہیں، یہ کوئی اور دنیا کے لوگ نہیں، ہماری ہی بستیوں کے رہنے والے ہیں، ہر شہر، ہر محلے اور ہر علاقے کے علماء ان سے شاکی ہیں، اور ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ شیخ ناصر چاہیں تو انہی پر فخر کر سکتے ہیں، اب خجندی کو دیکھیے، جسے شیخ ناصر علامہ کہہ کر یاد کرتے ہیں اور اس کے رسالہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں،

وہ اپنے رسالہ میں لکھتا ہے کہ:

اس طریقے کو حاصل کرنا بہت آسان ہے، اس کے لیے صرف موطأ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، جامع ترمذی اور نسائی کافی ہیں، یہ کتابیں معروف ومشہور ہیں، آسانی سے دستیاب ہیں، لہٰذا ان کا علم حاصل کرو، اور اگر تم خود نہ سمجھ سکو تو اپنے کسی ساتھی سے سمجھ لو، پھر تمہارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہتا، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مزید لکھتا ہے کہ:

اگر کسی مسئلے میں رسول اللہ ﷺ سے متعدد روایات ہوں اور تمہیں علم نہ ہو کہ کون سی پہلے اور کون سی بعد میں ہے، تو سب پر عمل کر لو،

اب بتائیں! کیا اس طرزِ فکر میں اس مذہبیت کے اُس معنیٰ کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے جسے شیخ ناصر نے رد کیا تھا؟ کیا یہ طرزِ عمل ائمہ کی پیروی کے دروازے بند نہیں کرتا؟ دیکھیے خجندی نے ان چھ معروف کتابوں (موطأ، صحیحین، سنن ابی داود، جامع ترمذی، نسائی) کو امت کے سامنے رکھ کر یہ باور کرایا کہ اب دین انہی سے براہِ راست حاصل کیا جا سکتا ہے، گویا اب اللہ نے مومنوں کو قتال سے بے نیاز کر دیا اور کسی مقلد یا متمذھب کی ضرورت نہیں رہی!

جہاں تک میرے اور اُن (شیخ ناصر) کے درمیان دوسرے معاملے کی بات ہے، تو وہ (البانی) ہمیشہ اِس کوشش میں رہے کہ خجندی کے ہر اُس جُملے کی ایسی تاویل کریں جو ظاہر میں غلطی یا حق سے ہٹنے کا تاثر دیتی ہے تاکہ وہ بات اُس حق کے مطابق ہو جائے جسے میں نے اپنی کتاب میں واضح کیا ہے،

مثلاً خجندی کا یہ کہنا کہ :

رہے فقہی مذاہب تو وہ اہلِ علم کی آراء اور ان کے فہم واِجتہاد کا نتیجہ ہیں اور اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ نے کسی پر ان کی پیروی لازم نہیں کی۔ (ناصر البانی کے نزدیک) یہاں "کسی پر لازم نہیں" سے مراد عام لوگ نہیں بلکہ وہ افراد ہیں جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہیں یعنی یہ حکم صرف مجتہدین کے لیے ہے نہ کہ عام مسلمانوں کے لیے،

اسی طرح خجندی کا یہ کہنا کہ :

اور یہ طریقہ (یعنی اجتہاد) حاصل کرنا آسان ہے اس کے لیے موطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، جامع ترمذی اور نسائی۔ کافی ہیں یہ کتابیں مشہور و معروف ہیں اور تھوڑے سے وقت میں حاصل کی جا

حالانکہ شیخ ناصر بخوبی جانتے ہیں کہ تمام ائمہ، حتیٰ کہ ابن تیمیہؒ، ابن القیمؒ اور شوکانیؒ تک اس بات پر متفق ہیں کہ ان کتابوں کا حاصل کر لینا کسی کو مجتہد نہیں بنا دیتا، ان سے براہِ راست استنباط کے لیے وہ گہری فقہی بصیرت اور اجتہادی ملکہ درکار ہے جو ہر کسی کو حاصل نہیں، یہی بات علامہ خجندی کی اس رسالہ کے خلاف ہے جسے شیخ ناصر انتہائی نافع قرار دیتے ہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ میری کتاب اپنی بنیاد کھو چکی ہے، سراسر غلط ہے،

حقیقت یہ ہے کہ اب بھی اس کی ضرورت باقی ہے اگرچہ دل چاہتا ہے کہ کاش امت کو اس کی حاجت ہی نہ رہتی۔

سکتی ہیں لہٰذا تمہیں ان کا علم حاصل کرنا چاہیے اگر تم نے خود یہ علم حاصل نہ کیا اور تمہارے دوسرے بھائی تم سے پہلے آگے بڑھ گئے اور انہوں نے تمہیں تمہاری زبان میں بات سمجھا دی تو پھر تمہارے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ (ناصر البانی کے نزدیک خجندی کی) یہ بات بھی صرف اُن لوگوں سے متعلق ہے جو اجتہاد کے مرتبے تک پہنچ چکے ہوں اور جو قرآن و سنت سے براہِ راست احکام اخذ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں، اس لیے اس عبارت میں کوئی غلط فہمی یا اعتراض کی گنجائش نہیں،

اسی طرح خجندی کا یہ کہنا کہ:

جہاں کتاب و سنت اور صحابہ کرامؓ کے اقوال موجود ہوں، وہاں انہی پر عمل واجب ہے، اور علماء کے اقوال کو چھوڑ دینا چاہیے۔ (شیخ ناصر کی رائے میں) اس سے مراد وہ شخص ہے جس نے دین کے علوم میں کچھ مہارت حاصل کر لی ہو، اور جو دلائل وان کے مفاہیم کو سمجھنے کی بصیرت رکھتا ہو۔ اس طرح خجندی کے رسالے میں جتنی بھی ایسی عبارتیں ہیں (شیخ ناصر کے خیال میں) وہ سب ایسی توجیہ کے قابل ہیں جو انہیں درست معنی پر محمول کرے، ان کے نزدیک خجندی کے کلام کو کتاب کے دوسرے حصوں میں موجود قیود و وضاحتوں کے ساتھ سمجھنا چاہیے، میں نے ان (البانی) سے کہا کہ: کسی بھی عالم کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ اتنے عام الفاظ میں بات کرے اور پھر اس سے کچھ اور مراد لے، نہ ہی کوئی شخص ان الفاظ سے وہ مطلب سمجھ سکتا ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔

اس پر انہوں نے کہا کہ:

یہ شخص بخاری النسب تھا، اس کی مادری زبان عربی نہیں بلکہ عجمی تھی اس لیے وہ عرب علماء کی طرح وضاحت سے بات نہیں کر سکا اور پھر وہ تو... اللہ کی رحمت کو جا پہنچا، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ چونکہ وہ مسلمان تھا اس کے کلام کو بہتر مفہوم پر محمول کریں اور جہاں تک ممکن ہو اس کے بارے میں حسنِ ظن رکھیں۔

یہ خلاصہ ہے اُس گفتگو کا جو ہماری تقریباً تین گھنٹے طویل ریکارڈ شدہ ملاقات میں ہوئی،

بعد میں اُس (البانی) نے مجھے دوبارہ ملاقات کی تجویز بھیجی، میں نے جواب میں لکھا کہ :

جہاں تک آپ کی دوسری ملاقات کی تجویز کا تعلق ہے تو پہلی نشست میں جیسا کہ میں نے عرض کیا مجھے محسوس ہوا کہ ہم میں سے کسی نے کوئی نیا فائدہ حاصل نہیں کیا نہ آپ اپنے اس خیال سے رجوع کر سکے کہ خجندی کا کلام بے غرض ہے اور نہ میں آپ کی تاویلوں سے مطمئن ہوا، میری رائے یہ ہے کہ اگر آپ حضرات شیخ محی الدین ابن عربیؒ جیسے بزرگوں کے کلام میں اتنی سی تاویل کر لیتے جتنی آپ نے خجندی کے کلام میں کی ہے تو آپ کو ان کی تکفیر یا تفسیق کا جواز نہ ملتا۔ بہر حال کل کی گفتگو کا حاصل یہی تھا کہ آپ خجندی کے دفاع میں تھے اور یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ اُس کے اقوال کا وہ مطلب نہیں جو میں نے اپنی کتاب میں بیان کیا، سوائے اس کے کہ میں نے اس کے کلام کو "انحراف" پر محمول کیا،

اب چاہے خجندی ویسا ہو جیسا آپ سمجھتے ہیں یا جیسا میں سمجھتا ہوں، مجھے اس پر خوشی ہے کہ آپ خود اُن خیالات کو قبول نہیں کرتے جو میں نے خجندی کے کلام سے سمجھے اور مجھے یہ بھی خوشی ہوگی اگر آپ عوام کے سامنے اس کے کلام کی وضاحت یا تصحیح شائع کریں اور اس میں ائمہ کے احترام اور غیر مجتہد کے لیے تقلید کی ضرورت پر زور دیں۔ اور جہاں تک (البانی سے) ملاقات کا تعلق ہے تو میں اس میں کوئی خاص فائدہ نہیں دیکھتا، گزشتہ روز کے اجتماع میں مجھے ایک ہی بات محسوس ہوئی کہ :

میں نے اپنی تین قیمتی ساعتیں ضائع کر دیں جنہیں میں کسی مفید کام میں صرف کر سکتا تھا، آپ حضرات میری خالص دعاؤں اور نیک تمناؤں کو قبول فرمائیں، یہی وہ جوابات اور تبصرے ہیں جو مجھے اپنی تحریر کے بارے میں موصول ہوئے اور یہی وہ ردِ عمل ہیں جنہوں نے میری لکھی ہوئی باتوں پر مجھے مزید مضبوطی سے قائم رکھا، اب مجھے پہلے سے زیادہ یقین ہے کہ لامذہبیت (بے مسلکی رویہ) شریعتِ اسلامی کے لیے سب سے خطرناک

بدعت ہے، اور جیسا کہ میری کتاب میں وضاحت کے ساتھ دلائل موجود ہیں وہی اس حقیقت کی صداقت کو ظاہر کر دیتے ہیں، مجھے اپنی بات میں کوئی حرف اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں سوائے چند توضیحات کے جو بیان کردہ سبب کے تحت ناگزیر ہوئیں، (1)

میں آج بھی خُجندی کی تحریر کو اسی طرح سمجھتا ہوں جیسے کوئی منصف مزاج عربی شخص سمجھے گا تو وہ بھی (خجندی) کو واضح حق سے ہٹا ہوا اور ایسی خطرناک غلطیوں میں پڑ جانے والا خیال کرے گا جن کی نشاندہی اور ان پر تنبیہ کرنا ضروری ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم نہیں دیا کہ ہم واضح جملوں اور صاف نصوص میں نئی کھڑکیاں کھولیں جن کے ذریعے ہم تاویل، تخصیص یا قیود داخل کریں اور پھر کہیں کہ یہی مؤلف کا مقصد تھا، اور ان نصوص کو لوگوں کے سامنے اس امید کے ساتھ پھیلائیں کہ وہ سب انہیں اسی خاص مفہوم میں سمجھیں، (جس مفہوم میں البانی نے سمجھا ہے) اللہ تعالیٰ نے ہمیں صوفیہ کی بعض لغزشوں کے بارے میں تاویل کرنے کا مکلف نہیں بنایا، باوجود اس کے کہ ان کے حالات میں بعض قابلِ تاویل پہلو موجود ہوں۔ (2)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کیسے مکلف کرے گا کہ ہم ایسے شخص کے کلام میں تاویل کے دروازے کھولیں، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عالم ہے اور جو واضح نصوص کے حوالے سے کسی علمی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے گفتگو کر رہا ہے تاکہ ابہام دور ہو اور بات صحیح طور پر سمجھ میں آئے؟ میری تحریر اس شخص کے لیے نقصان دہ نہیں اگر بالفرض یہ درست ہو کہ وہ (خجندی) اپنے مقصد کو صحیح طور پر بیان نہ کر سکا اور اس کا مقصود وہی تھا جو میں نے واضح کر دیا تو شاید وہ مجھ پر شکر گزار بھی ہو اور موت کے

---

(1) ۔ تحقیق اور فقہی مباحث میں مؤلف کے اصل مقصد اور متن کی صراحت کو برقرار رکھنا بنیادی اصول ہے، اضافی قیود یا تشریحات صرف اس وقت شامل کی جاتی ہیں جب متن یا مفہوم کے لیے ناگزیر ہوں۔ (مترجم)

(2) ۔ کیوں کہ فقہ اور تاویل کے اصول میں نصوص کی تشریح صرف اسی حد تک جائز ہے جو شریعت اور مؤلف کے مقصد کے مطابق ہو، نہ کہ ذاتی قیود ڈال کر متن کو مسخ کیا جائے۔ (مترجم)

پردے کے پار سے میرے لیے دعا کرے کیونکہ میں نے مسلمانوں کو اس کے کلام کے ممکنہ باطل مفہوم سے محفوظ رکھا، اسی طرح لامذہبیت کے داعیوں اور ان کے حمایتیوں میں سے بعض نے میرے اور شیخ ناصر کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں بے بنیاد باتیں پھیلائیں، مجھے ان پر تبصرہ کرنے کی کوئی پرواہ نہیں کیونکہ میں امید رکھتا ہوں کہ جو کچھ بھی میں نے اس سلسلے میں کیا، وہ خالص خدمتِ شریعت کے لیے تھا، اور میرا اجر صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، تاہم ایک بات پر رکنا ضروری ہے تاکہ قارئین حقیقت جان سکیں[1] ور وہ یہ ہے کہ انہوں (مخالفین) نے یہ غلط بات پھیلائی کہ: میرے والدِ محترم حفظہ اللہ جنہوں نے اس بحث کے ایک حصے میں ہمارے ساتھ شرکت کی، انہوں نے شیخ ناصر کے نظریات کی تائید کی اور میری مخالفت پر مجھے ملامت کی! اس افترا پر خاموش رہنا درست نہیں ورنہ یہ جھوٹ عوام کے دلوں کو گمراہ لوگوں کی طرف مائل کرنے کا ذریعہ بن جائے گا اور وہ یہ یقین کرلیں گے کہ دمشق کے فقیہ و عالم شیخ ملا رمضان نے ان آراء کی تائید کی جو دراصل ان لوگوں نے پھیلائی تھیں، اسی لیے میرے والدِ محترم حفظہ اللہ نے مجھے حکم دیا کہ قارئین کے سامنے اس بہتان کی حقیقت واضح کروں، جو سراسر بے بنیاد ہے، اور آڈیو ریکارڈ پر محفوظ پوری گفتگو بھی اس وضاحت پر گواہ ہے مزید یہ کہ قارئین میرے والد کی تصدیق شدہ تحریر بھی اس مقدمے کے بعد اسی کتاب میں پاویں گے، آخر میں، میں ان حضرات سے معذرت پیش کرنا چاہتا ہوں جنہیں یہ کتاب ان کی رائے کے مخالف ہونے کی وجہ سے ناگوار گزری، میری خواہش ہے کہ میں کوئی ایسا راستہ پاسکوں جس سے ان کے دل خوش ہوں، مگر ساتھ ہی آزاد اور غیر جانبدار علمی تحقیق بھی جاری رہے جو صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو، لیکن افسوس، میں اس راستے تک پہنچنے سے قاصر ہوں، شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر حضرات جیسا کہ میں نے

([1]) ۔ جھوٹی افواہوں اور غیر مستند بیان کی اصلاح اور قارئین کو اصل موقف سے آگاہ کرنا ایک ضروری علمی فریضہ ہے۔ (مترجم)

مشاہدہ کیا صبر نہیں کرتے کتاب کو مکمل نہیں پڑھتے بس چند صفحات دیکھ کر اپنی رائے قائم کر لیتے ہیں اور اپنے دل میں جو رنجش ہے اس کے ساتھ خود کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ان کے تمام دریچے مضبوطی سے بند ہیں!

ہمارے سلف صالحین یعنی گزرے ہوئے بزرگ علماء اور ائمہ آپس میں علمی مناقشات کرتے تھے ہر ایک اپنے نظریات اور مسلک کو پیش کرتا جو دوسروں سے مختلف ہوتا مگر وہ ایک دوسرے کی آراء کا احترام اور غور سے مطالعہ کرتے، پھر یا تو وہ کسی حد تک متفق ہو جاتے یا اگر دلائل محتمل ہوں اور شبہات گہرے ہوں تو ہر ایک اپنے موقف پر قائم رہتا لیکن اس حال میں بھی وہ ایک دوسرے کی قدر و عظمت کو تسلیم کرتے اور اجتہاد کی گنجائش رکھتے، [1]

لہٰذا علمی گفتگو ہی وہ بنیادی سبب تھی جس نے ان زمانوں میں علمی بیداری اور امت کے اتحاد کو جنم دیا، اور آج بھی یہی علمی بحث و مکالمہ اتحادِ امت اور فکری پختگی کے لیے سب سے مضبوط ضامن ہے، [2] میں نے بھی اپنی اس کتاب میں اسی طریقے کو اپنایا ہے اور میرا مقصد وہی نتیجہ حاصل کرنا تھا جو سلف صالحین کا تھا، تو آخر ان بھائیوں کو کیا ہوا کہ وہ ہمارے ساتھ کینہ، بغض اور تعصب کے ساتھ پیش آتے؟ اور کیوں وہ کتاب پر حکم لگاتے جبکہ نہ انہوں نے اسے صحیح طور پر پڑھا، نہ اس پر غور کیا؟ ہم نے کبھی انہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا کہ ان کے بعض افکار درست نہیں تو ان کا جواب ہوتا تھا کہ:

---

[1]- سلف صالحین کے اجتہاد اور علمی اختلافات میں اصول یہ تھا کہ اختلاف کے باوجود احترام، تواضع اور علمی دلیل کا احترام برقرار رہتا تھا اسی سے امت میں فکری اتحاد قائم رہا۔ (مترجم)۔

[2]۔ علمی مکالمہ صرف اختلاف کو بڑھانے کا ذریعہ نہیں، بلکہ فکری بیداری اور امت کی مضبوطی کا باعث ہے، اختلاف کو علمی اصولوں اور دلیل کے دائرے میں رہ کر ہی حل کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

فلاں آدمی نے اجتہاد کیا، رائے قائم کی اور جو اس کے دل کو مطمئن ہوا وہ لکھ دیا، تم بھی لکھو اور علمی طور پر اس کا جواب دو! لیکن آج جب ہم نے ان کی اسی وصیت پر عمل کرتے ہوئے تحقیق کے دائرے میں علمی جواب دیا تو وہ اس پر ناراض ہو گئے! انہوں نے ہماری تحریروں سے بیزاری ظاہر کی، بعض نے قارئین کو انہیں پڑھنے سے روکنے کی کوشش کی، اور ہمیں اختلاف و تفرقہ پھیلانے کا الزام دیا، بلکہ نصیحت کرنے لگے کہ ہم اس کام کو چھوڑ کر کسی اور مشغلے میں لگ جائیں!

یاد رکھو! سماجی اور دینی نقصان ان علمی و موضوعی مباحث میں نہیں ہے جو لائبریریوں میں چھپتے اور عام ہوتے ہیں بلکہ اس میں دین و دنیا کا سراسر فائدہ ہے، نقصان تب ہوتا ہے جب کوئی شخص اعلیٰ علمی بحث سے تنگ آجائے اور اپنے ردِ عمل میں گھٹیا مناظرے، دشمنی یا تعصب کا رویہ اختیار کرے، میں اللہ عزوجل سے دعا کرتا ہوں کہ میرے کسی بھی علمی کام میں کسی شخص پر زیادتی، نفسانی غصے کی تسکین یا کسی تعصب کی آگ بھڑکانے کا شائبہ بھی نہ ہو، اور وہ میری زبان اور قلم کو کسی مسلمان بھائی کی دل آزاری یا توہین سے محفوظ رکھے۔

دمشق

جمادی الثانی

۱۳۹۰ھ

آب ۱۹۷۰ء

محمد سعید رمضان البوطیؒ

مصنف کے والد کا پیش کلمہ

میں محمد سعید رمضان کا والد کہتا ہوں کہ جس نے میرے بارے میں یہ گُمان کیا کہ میں نے ناصر (البانی) کے کلام کی تائید کی ہے، اس نے دراصل تحقیق و مناظرہ کے علم میں سے تھوڑا سا ذائقہ بھی نہیں چکھا، بھلا میرے قول سے اُس کی تائید کیسے سمجھی جا سکتی ہے؟ میں نے تو اس سے صرف اتنا کہا تھا کہ جب کوئی لفظ مُطلق طور پر بولا جائے تو اس سے مراد اس شے کا کامل و حقیقی مصداق ہوتا ہے،

چنانچہ فقہاء نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو یہ کہے کہ :

اگر تو نماز پڑھے تو تجھے طلاق ہے، پھر وہ ایسی نماز ادا کرے جو غیر شرعی ہو مثلاً ارکان یا شروط کے بغیر، تو طلاق واقع نہیں ہو گی، کیونکہ ایسی ادائیگی کو نماز نہیں کہا جاتا، یہ سنتے ہی میرا مخاطب خاموش ہوا، حق مان لیا، اور میری بات پر رضامند ہو گیا.

پھر میں نے اس سے کہا کہ : یہ کتاب اللامذھبیۃ تو اہلِ علم کے لیے لکھی گئی ہے عوام کے لیے نہیں، پس میرے قول کا مقصود یہ تھا کہ : جس طرح تم اپنے لیے یہ حق رکھتے ہو کہ مصنف کے مطلق کلام سے اس کی مراد دَریافت کرو، ویسے ہی جان لو کہ اہلِ علم کے لیے جواب علمی اصطلاحات ہی میں مضمر ہوتا ہے،

خواہ مصنف نے اپنے مقصود کو لفظوں میں صراحت نہ دی ہو. پھر تعجب ہے اور بے حد تعجب ہے کہ مجھ پر یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ میں اس شخص کا حامی ہوں جو یہ کہتا ہے کہ ائمہ مجتہدین کے مذاہب دین کا حصہ نہیں! حالانکہ جب میں نے اس کے سامنے یہ حقیقت واضح کی کہ رسولِ اکرم ﷺ نے نہ صرف اجتہاد کو دین میں تسلیم فرمایا بلکہ مجتہد کی نماز، اگرچہ خطا پر ہو صحیح قرار دیا، لہذا یہ اقرارِ نبوی خود دین ہی کا حصہ ہے،

تو وہ شخص (البانی) بولا کہ :

لیکن یہ نماز حق نہیں بلکہ باطل ہے!

افسوس! وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس کے اس قول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ گویا نبی ﷺ نے باطل کو حق قرار دیا! (اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے، اور یہ گمان اس کے شایانِ شان نہیں۔)

بس یہی ایک بات کافی ہے اس کے حال کا پردہ اٹھانے کے لیے کہ وہ اپنے نفس کی پیروی میں اندھا ہو چکا ہے، اور یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ہلاکت کے گڑھے میں جا گرا ہے، اور اس ساری گفتگو کی ریکارڈنگ ہی اس امر کی روشن گواہی ہے۔

ملا رمضان

پہلی اشاعت کا مقدمہ اس رسالے کے اوراق کے پس منظر میں

میں مدتوں سے یہ آرزو رکھتا تھا کہ کاش کوئی مُخلص اور دَرد مند دل رکھنے والا شخص ایسا مل جائے جو اس نازک موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت سے مجھے بے نیاز کر دے، میں ہمیشہ یہ چاہتا رہا کہ میری توجہ اور میری مصروفیت ان چھوٹی موٹی باتوں کی طرف نہ مڑ جائے جو میرے نزدیک آج کے دنوں میں ہر مسلمان پر فرضِ عین سے کم نہیں، یعنی مسلمانوں کے موجودہ حالات کا سنجیدہ مطالعہ، ان کی اجتماعی زندگی میں سرایت کر جانے والی اُن مہلک بیماریوں کی تحقیق جو ان کے بدنِ اُمت کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر چکی ہیں، یہی بیماریاں ہیں جنہوں نے امتِ مسلمہ کو کمزوری، تفرقے اور ذلت کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے، یہاں تک کہ وہ اب فنا، بربادی اور صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کے خطرے سے دوچار ہیں، اگر انہوں نے فوراً، اور سب سے نزدیک راستے سے اپنی اصلاح اور نجات کی کوئی تدبیر نہ کی، جی ہاں میں بارہا یہ چاہتا رہا کہ اپنے قلم اور اپنی فکر کو ان اہم ترین اور فیصلہ کن مسائل سے ہٹا کر معمولی اور ظاہر بدیہی امور میں نہ اُلجھاؤں، مگر سوال یہ ہے کہ آخر کیا کیا جائے اُن لوگوں کے ساتھ جو انہی بدیہی حقیقتوں کو الٹ پلٹ کر اختلاف اور مناقشے کا میدان بنا دیتے ہیں؟ جو ایسی صاف اور واضح باتوں کو بحث و جدل کے پردے میں ڈھانپ دیتے ہیں اور پھر انہیں زبردستی اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے یہی وہ بنیادی مسائل ہوں جس پر امت کی نجات موقوف ہے؟ یوں وہ ان حقیقی راہوں کے بیچ رکاوٹ بن جاتے ہیں جن سے گزر کر ہم اس سنگین بیماری کا علاج ڈھونڈنے نکلے تھے،

ذرا سوچیئے! اگر آپ کسی ایسے شخص کو، جسے اچانک زخم لگا ہو اور خون تیزی سے بہہ رہا ہو، بچانے کے لیے قریبی اسپتال لے جا رہے ہوں اور اسی وقت کوئی کہیں سے نکل آئے جو آپ کا راستہ روک دے، زخمی کو آپ سے چھین لے اور آپ کے سامنے اس کی جان بچانے کا دروازہ بند کر دے تو پھر آپ کیا کریں گے؟ اور پھر وہ (رکاوٹ ڈالنے والا شخص) اُس زخمی کو اٹھا کر کسی حمام کی طرف دوڑنے لگتا ہے، تاکہ پہلے اُس کے بدن کو صاف کرے، پھر اس پر کسی خوبصورتی کے منصوبے کا تجربہ کرے! کیا اس بے چارے زخمی

کی جان بچانے کا کوئی دوسرا راستہ باقی رہ جاتا ہے سوائے اس کے کہ آپ اسے اُس پاگل کی بات ماننے سے روکیں، اسے اس کی گرفت سے بچائیں اور پھر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے طبیب کے پاس پہنچائیں تاکہ اس کی جان بچ جائے؟ بس مسلمانوں کا آج کا سانحہ بھی کچھ ایسا ہی ہے اُمت جس بلا میں مبتلا ہے وہ دراصل فکر میں الحاد، عمل میں ڈھلمل پن اور عقیدہ واصول سے دوری کی بلا ہے، یہ تین زہر ایسے ہیں جنہوں نے امت کے دل ودماغ کو مفلوج کر دیا ہے، جنہیں مسلمانوں کی حالتِ زار کا احساس ہے ان کے لیے لازم ہے کہ وہ ان ہی تین مہلک بیماریوں کا علاج تلاش کریں، لیکن سوال یہ ہے کہ جب علاج کی راہ میں چھوٹی چھوٹی بحثوں، لاحاصل مناقشوں اور غیر ضروری اختلافات کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہوں تو بھلا علاج کیسے ممکن ہے؟ وقت ضائع ہوتا ہے، قوت تحلیل ہوتی ہے، عقل اور ایمان کمزور پڑ جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک نئی مصیبت جنم لے لیتی ہے، پھر دیکھو تو یہ حال ہے کہ جن لوگوں کو آپ ایمان اور سچے عمل کی راہ پر لانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے اور ایمان کے درمیان نئے فتنوں کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں! نتیجہ یہ کہ وہ ایک ایسی گمراہی اور تذبذب کے دائرے میں بھٹکنے لگتے ہیں جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام،

کوئی نعرہ لگاتا ہے کہ: چاروں ائمہ کی تقلید کفر ہے!

کوئی فتویٰ دیتا ہے کہ: کسی خاص مذہب کی پابندی گمراہی ہے!

اور کوئی یہ جملہ دہراتا ہے کہ: جو اپنے امامِ مذہب کو پیشوا مانتا ہے وہ گویا اللہ کے سوا ایک اور رب بنالیتا ہے! پھر وہ شخص جو ابھی ابھی ایمان کی راہ پر قدم رکھ رہا تھا جب مسلمانوں کی تاریخ، ان کے بزرگوں، ان کے علماء اور ان کی علمی طبقات کو دیکھتا ہے تو اسے یہ تاریخ ہدایت، علم اور روشنی کی بجائے گویا مرتدین، گمراہوں اور راہِ حق سے منحرف لوگوں کی داستان نظر آتی ہے! اور افسوس صد افسوس یہ وہی تاریخ ہے یہ وہی لوگ ہیں جن کے توسط سے اس نے اسلام کو پہچانا، جن کی تعلیمات اور سیرت سے وہ متاثر ہوا اور جن کے ذریعے اس کے دل میں ایمان کی روشنی پیدا ہوئی. پھر وہی شخص جو خیر خواہی اور اصلاحِ دین کے خلوص سے سرشار ہے دل

میں یہ ارادہ باندھتا ہے کہ وہ چاروں ائمہ کی تقلید سے آزاد ہو کر براہِ راست قرآن و سنت سے شریعت کے احکام سمجھے گا، مگر کیا دیکھتا ہے؟

کہ وہ خود اور اس جیسے دوسرے لوگ ایک بے کنار سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں ایسا سمندر جس کا نہ کوئی کنارہ ہے، نہ تہہ، نہ روشنی نہ ان کے پاس کوئی کشتی ہے، نہ لہر سے بچنے کا کوئی سہارا، نہ رہنمائی کا کوئی چراغ، اب بتاؤ، اس حال میں ان کا اجتہاد کیسے معتبر ہو سکتا ہے؟ اگر کسی نتیجے تک پہنچ بھی جائیں تو وہ نتیجہ کیسے درست اور قابلِ اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ تو ایک ایسی دراڑ ہے جو کسی بھی بنیاد کو تھام نہیں سکتی ایک ایسی کمزوری جو کسی بھی عمارت کو زمین بوس کر دیتی ہے، میں یہ باتیں خیالی طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ یہ ایک زندہ حقیقت ہے جسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، دمشق یونیورسٹی کے شعبۂ ادب کا ایک طالبِ علم میرے پاس آیا، چہرے پر تازہ ایمان کا نور تھا اور زبان پر حیرانی کے بادل کہنے لگا کہ: میں نے نئے سرے سے اسلام اور اس کی عبادات کی طرف توجہ کی ہے، میں نے امام شافعیؒ کی فقہ پر ایک کتاب پڑھی اور اب انہی کے مذہب پر عمل کر رہا ہوں، لیکن مجھے ایک رسالہ ملا ہے جس میں لکھا ہے کہ:

کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ چاروں میں سے کسی ایک امام کی تقلید کرے، جو ایسا کرتا ہے وہ کافر اور گمراہ ہے اور اس پر لازم ہے کہ احکام کو براہِ راست قرآن و سنت سے لے، مگر میں قرآن کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا بھی نہیں جانتا اور اس کے معانی اور احکام سے تو سراسر ناواقف ہوں، اب میں کیا کروں؟ میں اُس کی آنکھوں میں اضطراب اور دل میں سچائی دیکھ رہا تھا، مگر خود سے سوال کیا کہ: میں اسے کیا جواب دوں؟ کیا اسے کہہ دوں کہ یہ ایک معمولی بات ہے؟ کہ میں دین کے بڑے بڑے مسائل پر کام کر رہا ہوں اور ایسی باتوں میں وقت ضائع کرنا میری شان کے خلاف ہے؟ کیا واقعی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسے مسائل کو چھیڑنا نہیں چاہتا تاکہ کوئی نیا اختلاف پیدا نہ ہو؟ کیا میں یہ گمان کر سکتا ہوں کہ اُمت کے بڑے بڑے مسائل کا حل پیش کر دوں جب کہ ایسے سینکڑوں ذہن اس قسم کی گمراہیوں میں اُلجھے ہوئے ہوں؟ یہ کوئی ایک

طالبِ علم نہیں تھا بلکہ یہ تو اُن سینکڑوں، ہزاروں افراد کی حالت ہے جنہیں ایک گمراہ رسالے نے ان کے ایمان، ان کی تاریخ اور ان کے دین کی حقیقت کے بارے میں شک، حیرانی اور جہالت کے اندھیروں میں دھکیل دیا ہے، اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس موضوع پر خاموشی ممکن نہیں رہی، یہ اب ایک انفرادی مسئلہ نہیں رہا بلکہ امت کے بنیادی فکری بحران کا حصہ بن چکا ہے، یہ فیصلہ ہمارا اپنا نہیں بلکہ یہ توان لوگوں کا پیدا کردہ جبر ہے جنہوں نے اصلاحِ امت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں، انہوں نے اُس زخمی کو جس کا خون مسلسل بہہ رہا تھا، طبیب تک پہنچنے سے روک دیا اور ضد یہ کی کہ پہلے اسے غسل کرواؤ پھر اس پر خوبصورتی کا کام کرو! اور پھر یہی لوگ ہم سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم ان کی اس گمراہی پر خاموش رہیں تاکہ کہیں امت میں اختلاف پیدا نہ ہو! کیا یہ دانشمندی ہے؟ نہیں بلکہ یہ تو کھلی دیوانگی ہے! اور ہم اس دیوانگی پر خاموش نہیں رہیں گے، نہ ہی ان کے اس مضحکہ خیز جواز کے آگے جھکیں گے، ہمیں حق واضح کرنا ہوگا اور کم از کم یہ تو کرنا ہوگا کہ ہم مریض کو ان کے دھوکے سے خبردار کر دیں، تاکہ وہ باطل کے جال میں نہ پھنسے، واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ ہمیں اس مسئلے میں اُلجھنا پڑ رہا ہے، جس پر امت صدیوں سے متفق رہی مسلمان ہمیشہ سے جانتے آئے ہیں کہ لوگ مجتہد اور مقلد کے دو درجوں میں تقسیم ہیں، مقلد پر لازم ہے کہ وہ کسی مجتہد کی پیروی کرے، اگر چاہے تو ایک مجتہد کی تقلید پر قائم رہے، اور اگر چاہے تو کسی دوسرے مجتہد کی طرف منتقل ہو جائے، (جس کی بات اُس کے دل کے لیے اقرب الی الصواب ہو) یہی واضح اور سیدھا اصول صدیوں تک امت کے درمیان رائج رہا، مگر ہمارے زمانے میں ایک فریق اُبھرا جس نے لوگوں کے سامنے ایک نیا اور عجیب دین پیش کر دیا، اس نے کہا کہ:

جو شخص کسی مجتہد کی تقلید کرے، وہ کافر ہے، کیونکہ کتاب وسنت کی پیروی معصوم کی پیروی ہے اور ائمہ اربعہ کی پیروی غیر معصوم کی پیروی ہے! لہٰذا سب کو چاہئے کہ معصوم کی پیروی کریں اور غیر معصوم سے آزاد ہو جائیں، حالانکہ دنیا کا ہر عاقل جانتا ہے کہ اگر تمام لوگ براہِ راست معصوم (نبی ﷺ) کے کلام کے معنی و مراد سمجھنے کی صلاحیت رکھتے، تو امت میں کبھی مقلد و مجتہد کی تقسیم باقی نہ رہتی،

اور پھر اللہ تعالیٰ اپنی پاک کتاب میں فرماتے ہیں: فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔ (النحل: 43) یعنی: اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھو. اللہ تعالیٰ نے قرآن کی اس آیتِ مبارکہ میں غیر معصوم "اہلِ ذکر" کی طرف رجوع کا حکم دیا حالانکہ قرآن وسنت خود معصوم ہیں! کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج ہمیں یہی بات از سرِ نو دہرانا پڑ رہی ہے جو ہر سمجھدار انسان کے نزدیک بالکل واضح ہے، مگر افسوس! یہ مسئلہ ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے، ایک شخص، جس نے اپنا نام تک ظاہر نہیں کیا، ایک رسالہ شائع کیا جس کا نام تھا:

"کیا مسلمان پر کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی لازم ہے؟

اور اپنے اس رسالے کو محمد سلطان المعصومی الخجندی المکی کی طرف منسوب کیا، جو مسجدِ حرام میں تدریس کرتے ہیں، اس رسالے میں لکھا گیا کہ:

جو شخص کسی خاص مذہب کا پابند ہو وہ کافر ہے، تمام ائمہ کے مقلدین احمق، جاہل، گمراہ اور فرقہ پرست لوگ ہیں، اور ان مقلدین کے بارے میں اللہ کا یہ قول لاگو ہوتا ہے: اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابًا من دون الله (التوبہ: 31)

یعنی :اور وہ سب سے زیادہ خسارے والے ہیں، جن کے اعمال ضائع ہو گئے، حالانکہ وہ سمجھتے رہے کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ پھر اس گمنام ناشر نے یہ رسالہ عام مسلمانوں، طلبہ، مزدوروں اور ہر طبقے میں پھیلا دیا، نتیجتاً بہت سے لوگ میرے پاس آئے اور اپنی اُلجھنیں میرے سامنے رکھیں، اپنے ایمان، اپنی عبادات اور اپنی علمی تربیت کے بارے میں حیرانی کے عالم میں تھے. اُن میں سے ایک شخص خوشی سے کہنے لگا کہ:

دیکھیں! یہ فقہ جسے آپ پڑھاتے ہیں یہ تو صرف ائمہ کے قانونی خیالات ہیں جنہیں بعد میں قرآن وسنت سے جوڑ دیا گیا، اسلام تو بس اپنی عبادات اور پانچ ارکان کا نام ہے، جنہیں ایک بدوی چند منٹوں میں سیکھ لیتا تھا اور چلا جاتا تھا، یہی تو اسلام ہے! آپ لوگ خواہ مخواہ اسے قانونِ مدنی، فوجداری اور بین الاقوامی

بنا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام دین و ریاست دونوں ہے، دیکھ لیجیے، خود مسجدِ حرام کے مدرس نے آپ کی بات کی تردید کر دی ہے!

اب بتایئے، کیا میں اِس افسوسناک صورتِ حال پر خاموش رہوں؟ کیا صرف اس لیے کہ کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ بحث اہم تر مسائل سے انحراف ہے؟ کیا اس سے زیادہ اہم کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ ہم ان لوگوں کی حیریت، ان کا فکری بگاڑ اور ان کے دلوں میں ائمہ و علما کے خلاف اُٹھائے گئے شکوک کو دور کریں؟ یہ ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں لوگ ہیں جو شافعی، مالکی، حنفی، حنبلی سب ائمہ کو اسلام کے ستون مانتے ہیں، یہ سب نہ کافر ہیں، نہ گمراہ، نہ جاہل، یہی تو وہ ائمہ ہیں جنہوں نے شریعت کے قلعے کی حفاظت کی اور اسے امت تک پہنچایا تاکہ ہر دور میں مسلمان دین اور عمل کے صحیح اصولوں پر قائم رہیں۔ اور کیا اس سے بڑھ کر کوئی فریضہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو خبر دار کریں جو اس رسالے میں اپنی منزلِ مقصود تلاش کر چکے ہیں اور پھر اسی جوش و شعور سے مستشرقین کے سب سے بڑے جھوٹ کو دہرانے لگے ہیں،

جسے جرمن مستشرق "شاخت" نے ایجاد کیا تھا کہ :

اسلامی فقہ دراصل چند قانونی دماغوں کی اختراع ہے جنہوں نے اپنی ذہانت کو قرآن و سنت سے منسوب کر دیا اور اسلام کا مضمون اتنا سادہ و محدود تھا، جسے ایک بدوی چند لمحوں میں سمجھ لیتا تھا، تو پھر بعد میں اتنے تفصیلی احکام کہاں سے آ گئے؟ کیا اس صریح جہالت اور فریب کو بے نقاب کرنا سب سے ضروری کام نہیں؟ یقیناً ہے، لہٰذا لازم ہے کہ حق واضح کیا جائے اور باطل کی حقیقت بیان کی جائے، لیکن میں اپنی اس رسالے میں اس طرح کی بدزبانی نہیں کروں گا جس طرح رسالہ نگار نے کی جو جگہ جگہ کفر، ضلالت، جہالت، حماقت، اندھی تقلید جیسے الفاظ اُچھالتا ہے، میں ان مسائل کو خالص علمی، تحقیقی اور متوازن انداز میں بیان کروں گا، بغیر افراط و تفریط کے جو دراصل آج کے علمی و فکری انحراف کی جڑ ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا

ہوں کہ وہ ہم سب کو راہِ حق کی طرف لوٹادے، ہمارے دلوں کو تعصب، ضد، کینہ اور نفرت سے پاک کر دے۔ بے شک، وہی لطیف و خبیر ہے جو دلوں کے راز جانتا ہے اور ہر حال میں رہنمائی کرنے والا ہے۔

محمد سعید رمضان البوطی

دمشق — ۲۳ ذی القعدہ ۱۳۸۹ھ

رسالہ خجندی میں مذکور مباحث کا خلاصہ

سب سے پہلے مناسب ہے کہ میں قارئین کے سامنے اس رسالے کا خُلاصہ رکھوں، خواہ اس (رسالے) کا مصنف اور ناشر کوئی بھی ہو پھر اسی خلاصے کو آئندہ ابواب میں تحقیق کا موضوع بناؤں اور (میری اس کاوش) کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے خیر خواہی ہو، ایک خالص علمی اور غیر جانب دار منہج کے مطابق، میرا ارادہ اس میں نہ ذاتی مفاد ہے، نہ کسی محقق کی تحقیر یا کسی مصنف کی تکفیر اور میں اپنے قارئین سے بھی یہی اُمید رکھتا ہوں کہ وہ بھی میرے ساتھ اسی اصول پر چلیں جسے میں نے اپنے لیے لازم کیا ہے :

یعنی نظر میں دیانت، فکر میں انصاف، اور مطالعے میں اخلاص لہٰذا آپ جو کچھ پڑھیں اسے صرف علم و حق کے لیے پڑھیں اور جس نتیجے تک تحقیق پہنچائے اس پر اعتماد کریں بغیر کسی تعصب یا تقلیدِ (مذموم) کی زنجیر کے، پھر قاری خود محسوس کرے گا کہ مسلمانوں میں ائمہ اربعہؒ کی پیروی کے مسئلے پر شور و غوغا برپا کرنا در اصل ایک ایسا بے بنیاد ہنگامہ ہے جیسے ایک پیالی میں طوفان برپا کرنا،

خیر مصنفِ (رسالہ) نے اپنی بحث کا آغاز ایمان اور اسلام کی حقیقت کے بیان سے کیا۔ چنانچہ اس نے حدیثِ جبرائیل ذکر کی، جس میں حضرت جبرائیلؑ نے رسول اللہ ﷺ سے اسلام، ایمان اور احسان کے بارے میں سوال کیا،

اسی طرح اس نے "بُنِيَ الإسلامُ على خمسٍ" والی حدیث نقل کی،

پھر وہ حدیث بیان کی جس میں ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں کہ اگر میں اسے انجام دوں تو جنت میں داخل ہو جاؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا : یہ کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں.. وغیرہ،

اسی طرح اس صاحبِ رسالہ نے وہ واقعہ بھی نقل کیا کہ. ایک آنے والا آیا اس نے اپنے اونٹ کو مسجدِ نبوی کے دروازے پر بٹھایا پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے اہم ارکان کے بارے میں دریافت کیا، مصنف نے ان احادیث کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام محض چند الفاظ اور چند آسان اعمال پر مشتمل ہے، جنہیں کوئی بھی عام مسلمان یا بدوی سمجھ سکتا ہے اور یہ اتنے سہل ہیں کہ ان کے لیے کسی امام کی تقلید یا مُجتہد کی پیروی کی کوئی ضرورت نہیں، پھر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ مذاہبِ فقہیہ دراصل اہلِ علم کی آراء اور ان کے فہم کے نتائج ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ نے نہ ہی اس کے رسول ﷺ نے کسی کو ان آراء کی پیروی کا پابند کیا ہے،

لہٰذا اس کے نزدیک چاروں فقہی مذاہب یا دیگر مکاتبِ فقہ میں سے کسی ایک کی پابندی نہ واجب ہے نہ مستحب۔ بلکہ اگر کوئی شخص ہر معاملے میں ایک ہی مذہب سے وابستہ رہے تو وہ تعصب و تقلیدِ محض میں مبتلا ہے اور ایسے ہی لوگ قرآن کے اس فرمان کے مصداق ہیں:

اور جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور گروہ گروہ ہو گئے،

مصنف کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام پر ثابت قدمی کی بنیاد صرف قرآن و سنت پر عمل ہے، کیونکہ وہی معصوم ہیں، جبکہ ائمہ کی تقلید غیر معصوم کی پیروی ہے، جو اتباعِ معصوم سے انحراف کے مترادف ہے۔ (رسالہ: ص٦،٧)

پھر اس نے یہ بات طے کی کہ فقہی مذاہب ابتدائی تین صدیوں کے بعد پیدا ہونے والی بدعات ہیں لہٰذا وہ گمراہی ہیں، آخر میں مصنف نے سوال اٹھایا کہ:

کیا کوئی ایسی دلیل موجود ہے کہ انسان سے قبر میں اس کے مذہب یا مسلک کے بارے میں سوال پوچھا جائے..؟

مصنفِ (رسالہ) آگے بڑھ کر یہ تصور پیش کرتا ہے کہ گویا چاروں فقہی مذاہب رسولِ اکرم ﷺ کے طریقِ ہدایت کے مقابلے میں نمودار ہوئے ہوں،

چنانچہ وہ فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

در حقیقت وہی مذہب برحق ہے جس کی اتباع واجب ہے جو سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کا مذہب ہے، پھر ان کے بعد خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ، تو پھر یہ چاروں مذاہب کہاں سے آگئے؟ اور مسلمانوں پر کیوں لازم ٹھہرائے گئے؟ (رسالہ: ص: ۱۲)

اس کے بعد وہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ایک قول نقل کرتا ہے جسے اپنے دعوے کی تائید میں پیش کرتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ دہلویؒ نے فرمایا کہ:

جو شخص ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کے تمام اقوال کو اختیار کرلے، اور کتاب و سنت کی طرف رجوع نہ کرے، تو اس نے اجماعِ امت کی مخالفت کی اور اہلِ ایمان کے راستے سے ہٹ گیا، پھر وہ مختلف دلائل اور نقول کے ذریعے یہ بات واضح کرتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی امام کی پیروی کرے تو اس پر لازم نہیں کہ عمر بھر اسی کے ساتھ وابستہ رہے، بلکہ اگر وہ کسی مسئلے میں قرآن و سنت کے دلائل پر غور کرکے اس کی حقیقت تک پہنچ جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ محض اپنے امام کے قول پر اصرار کرے اور اس علم کے برخلاف چلے جو اس نے براہِ راست قرآن و سنت سے حاصل کیا ہے، پھر وہ تقلید اور اتباع کے درمیان فرق کرتے ہوئے تقلید کو ایک مذموم اور مردود روش قرار دیتا ہے، اور اتباع کو ایک پسندیدہ و محمود طرزِ عمل سمجھتا ہے،

اس کے نزدیک اتباع کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے بارے میں سوال کریں، نہ کہ کسی دوسرے کے قول یا مذہب کے بارے میں، (ص ۱۴–۱۵)

پھر وہ کہتا ہے کہ اگر کسی مسئلے میں نبی اکرم ﷺ سے متعدد روایات مروی ہوں اور ان میں تقدم وتاخر معلوم نہ ہو اور یہ واضح نہ ہو سکے کہ کون سی روایت منسوخ ہے اور کون سی ناسخ تو ایسے حال میں تم پر لازم ہے کہ ان سب پر کبھی اس طرح عمل کرو اور کبھی دوسری طرح، یعنی کبھی ایک روایت کے مطابق اور کبھی دوسری کے مطابق، پھر وہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اگر مسلمانوں نے اسی اصول پر عمل کیا ہوتا تو یہ متعدد مذاہب اور تفریقیں ہر گز پیدا نہ ہوتیں۔ (ص ۱۷)

اس کے بعد وہ پھر وہی بات دہراتا ہے جو پہلے کہہ چکا تھا:

کہ مجتہد کبھی درست رائے تک پہنچتا ہے اور کبھی خطا بھی کر سکتا ہے، لہٰذا اس کی تقلید روا نہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ معصوم ہیں اس لیے آپ سے ہٹ کر کسی کی پیروی درست نہیں، پھر وہ اپنے اس مؤقف کو مختلف نصوص اور دلائل سے تقویت دیتا ہے اور ان آیات و احادیث سے استدلال کرتا ہے جو تعصب، اندھی تقلید اور حق کے مقابلے میں شخصی وابستگی سے منع کرتی ہیں، پھر مصنف دوبارہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ کسی خاص امام یا مذہب کی پابندی بدعت ہے، وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ صحابہ کرامؓ ہر معاملے میں قرآن و سنت کی طرف رجوع کرتے تھے اور جب کسی مسئلے میں نص موجود نہ ہوتی تو باہمی غور واجتہاد سے فیصلہ کرتے، لیکن تیسری صدی ہجری کے بعد تقلید اور تمذھب کی بدعت نمودار ہوئی، اس کے بعد وہ ائمہ کے مقلدین پر نہایت سخت تنقید کرتا ہے، انہیں قرآن کے الفاظ میں وحشی گدھوں [1] سے تشبیہ دیتا ہے اور انہیں دجل عناد اور شیطانی راہ پر چلنے والا قرار دیتا ہے۔ (ص ۲۴—۲۵)

([1]) ۔ یہ تعبیر قرآنِ کریم (سورۂ مدثر: ۵۰) حمر مستنفرة آیت سے لی گئی ہے، جہاں بے سمجھے بھاگنے والوں کو وحشی گدھوں سے تشبیہ دی گئی، مصنف رسالہ نے اسے طنزیہ انداز میں مقلدین کے لیے استعمال کیا، جو علمی منہج کے لحاظ سے غیر منصفانہ طرزِ تعبیر ہے اور صاحبِ مطالعہ جانتے ہوں گے کہ اپنے مخالفین کے لیے یہی طرز مرزا غلام احمد قادیانی واحمد رضا خان بریلوی کا بھی تھا۔ مترجم)

پھر وہ ان لوگوں کو بھی ہدفِ ملامت بناتا ہے جو اپنے ائمہ کے اقوال کو کتاب وسنت کے نصوص پر ترجیح دیتے ہیں اور اس ضمن میں ائمہ کرام کے ایسے اقوال پیش کرتا ہے جن میں انہوں نے خود اس بات سے روکا ہے کہ ان کا قول قرآن یا سنت کے مقابلے میں لیا جائے، مصنف انہی اقوال کو بنیاد بنا کر اپنی اصل بات کو تقویت دیتا ہے کہ تقلید اور کسی ایک مذہب پر جمود، شریعت میں ناپسندیدہ اور ممنوع ہے۔ (ص ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۳، ۳۴)

مصنف آخر میں ہر مسلمان کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اسلامی احکام کو سمجھنے کے لیے براہِ راست قرآن وسنت کی طرف رجوع کریں اور وہ یہ بات طے کرتا ہے کہ یہ کام دشوار نہیں بلکہ نہایت آسان ہے اس کے بقول، اس کے لیے زیادہ مطالعے یا مشقت کی ضرورت نہیں بلکہ (درج ذیل) صرف چند کتابیں ہی کافی ہیں:

موطاأمام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، جامع ترمذی، اور سنن نسائی۔ (ص ۴۰)

پھر وہ دوبارہ ان نصوص کے درمیان خلط کرتا ہے جو اس عالم کے لیے نازل ہوئی ہیں جو دلائلِ شرعیہ کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے باوجود اپنے امام کی رائے کو قرآن وسنت پر ترجیح دیتا ہے اور ان نصوص کے درمیان جو اس کے گمان کے مطابق مطلقاً کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی سے منع کرتی ہیں، یوں وہ مختلف اقوال کو ایک دوسرے سے گڈمڈ کر دیتا ہے، (ص ۴۰ومابعد)

پھر وہ قاری کو توجہ دلاتا ہے کہ وہ ابن خلدونؒ کی مقدمہ کا مطالعہ کریں اور دعویٰ کرتا ہے کہ ابن خلدونؒ نے اس میں یہ بات واضح کی ہے کہ فقہی مذاہب کا وجود اور ان کا رواج دراصل ظالمانہ سیاسی اقتدار اور غیر عرب حکمرانوں کی تسلط پسندی کا نتیجہ تھا۔ (ص ۴۵)

یہ ہے اس رسالے کا خلاصہ، اس کی تمام بحثیں، ابواب، اور منقول نصوص کا حاصل صرف یہ ہے کہ مسلمان کے لیے چاروں فقہی مذاہب میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستگی حرام ہے، ان میں سے کسی ایک کی پابندی کو وہ گمراہی بلکہ کفر قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ گویا اللہ کے سوا انسانوں کو رب بنا لینا ہے،

اس کے بقول مسلمان کو چاہیے کہ وہ براہِ راست قرآن و سنت سے احکام اخذ کرے اور اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو مختلف مذاہب کے درمیان اِدھر اُدھر پھرے کبھی ایک سے پوچھے، کبھی دوسرے سے۔ ص 38 یعنی کبھی ایک امام کی بات مانے تو کبھی دوسرے کی۔ ([1]) یہ جملہ رسالہ کے ص: ۲۹ پر بایں الفاظ موجود ہے۔

([1])۔) شیخ ناصر البانی (یعنی حامی رسالہ) کا کہنا ہے کہ اس رسالے میں خنجندی کا اپنا ایک جملہ ایسا موجود ہے جو گویا تمام انحرافات اور غلط تعبیرات کی اصلاح کر دیتا ہے اور خجندی پر کسی تنقید کی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا، یہ جملہ رسالہ کے ص: ۲۹ پر بایں الفاظ موجود ہے کہ : جان لو کہ علماء کے اقوال اور ان کے قیاسات کا اختیار کرنا۔ بمنزلہ تیمم ہے جس کی طرف اسی وقت رجوع کیا جاتا ہے جب پانی (یعنی نصِ صریح قرآن و سنت) موجود نہ ہو، لہذا جہاں کتاب و سنت اور اقوالِ صحابہ میں نص موجود ہو وہاں انہی کو اختیار کرنا واجب ہے اور علماء کے اقوال کی طرف رجوع جائز نہیں۔ شیخ ناصر نے جب ہمارے ساتھ مناقشہ کیا تو یہی عبارت بطورِ حجت پیش کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ہم نے اس فقرے پر غور کیا جس کی طرف شیخ ناصر نے بڑے اعتماد کے ساتھ رہنمائی کی تو وہاں ہمیں بہت بڑی گمراہی اور سخت تر اُلجھن نظر آئی،

یہ بالکل اس مثل کی مانند ہے جو کہی گئی کہ :

ضغث علی إبالة یعنی پہلے ہی بوجھ پر ایک اور بوجھ لاد دینا!

اگر یہ کہا جائے کہ جب بھی کسی مسئلے پر قرآن یا سنت کی کوئی نص مل جائے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اسی کو اختیار کریں اور ائمہ کے اجتہادات کی طرف رجوع کرنا حرام ہے تو یہ کس قدر غیر معقول اور انوکھا دعویٰ ہے؟ اور کہاں ہے اس میں اصلاح کی گنجائش؟ کیا ہم نے یہ ساری بحث اسی فکری شذوذ کے جواب میں نہیں لکھی؟ تم آج امتِ مسلمہ کے عام لوگوں کے سامنے صحیح بخاری اور صحیح مسلم رکھ دو اور ان سے کہو کہ ان کتابوں کے نصوص سے خود اپنے دین کے احکام سمجھ لیں پھر دیکھو کہ کس قدر اُلجھن، خطا اور دین میں کھلواڑ پیدا ہوتا ہے! کیا یہی وہ بات ہے جس کی دعوت خجندی دے رہا ہے اور جس کے دفاع میں استاذ ناصر البانی اس قدر حیرت

انگیز غیرت دکھا رہا ہے؟ علماءِ امت جن میں ابن القیم اور دوسرے ائمہ شامل ہیں اس بات پر متفق ہیں کہ احادیث کی کتابوں کا موجود ہونا کافی نہیں بلکہ صحیح فتویٰ اسی وقت ممکن ہے جب فقیہ کو استنباط اور اجتہاد کی اہلیت حاصل ہو

اور اگر کسی کے پاس یہ صلاحیت نہ ہو تو اس کے لیے شریعت نے یہی حکم دیا ہے کہ: فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ {اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھو۔ لیکن خجندی اور اس کے ہم نوا استاذ ناصر یہ کہتے ہیں کہ جہاں کہیں کتاب و سنت اور اقوالِ صحابہ کی نص موجود ہو وہاں ان ہی پر عمل لازم ہے اور علماء کے اقوال کی طرف رجوع ناجائز ہے! اب بتاؤ، ہم کس کی بات مانیں؟ ان علماء کی جن پر امت کا اجماع ہے جن میں ابن تیمیہ، ابن القیم اور دوسرے ائمہ شامل ہیں یا ان دو حضرات (خجندی اور ناصر البانی) کی، جنہوں نے اپنے رسالے میں ایک تنہا منفرد موقف اختیار کیا ہے؟ پھر خجندی کی بات پر غور کرو تو اس میں عجیب جہالت جھلکتی ہے، گویا وہ یہ سمجھتا ہے کہ ائمہ نے اپنے اجتہادات محض اپنی ذاتی آراء اور خیالات پر قائم کیے، بغیر کسی نص کے سہارے، اسی لیے اس کے خیال میں ان کی تقلید گویا تیمم کے درجے کی چیز ہے! حالانکہ ائمہ کے اجتہادات کی بنیاد ہی قرآن و سنت کے نصوص پر ہوتی ہے اور کوئی امام اگر کسی دینی مسئلے میں بغیر نص کے کوئی بات کرے تو وہ دین میں اضافہ ہوگا جو کسی مسلمان کے لیے قابلِ اتباع نہیں، ایسا شخص شریعت کے پانی سے نہیں بلکہ ریت سے وضو کر رہا ہوگا اور یہ نہ شریعت کا پانی ہے نہ تیمم!

امام شافعیؒ اپنے ''الرسالہ'' میں فرماتے ہیں کہ:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اپنی بات بغیر علم کے کہے بلکہ علم یا تو کتاب سے ہوگا یا سنت سے، یا اجماعِ امت سے یا آثارِ سلف سے یا ان سب پر مبنی قیاس سے اور قیاس کا حق صرف اسی کو ہے جو قرآن کے احکام ناسخ و منسوخ، عام و خاص، اور اس کے آداب و احکام سے واقف ہو، تم دیکھتے ہو کہ اجتہاد کی آخری حد یعنی قیاس بھی اسی وقت درست ہے جب وہ کسی نصِ شرعی پر قائم ہو پھر چاہے وہ نص قرآن کی و سنت کی ہو یا اقوالِ صحابہ کی اور درحقیقت صحابہ کے اقوال خود بھی سنت کی ایک شاخ ہیں سوائے ان معاملات کے جہاں خالص رائے کا دخل ہو، پھر خجندی یہ بھی تصور کرتا ہے کہ جہالت صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نص موجود نہ ہو لیکن اگر نص موجود ہو تو سب لوگ یکساں طور پر اسے سمجھ سکتے ہیں! گویا وہ یہ گمان رکھتا ہے

کہ نص کے ہوتے ہی ہر انسان مجتہد بن جاتا ہے اور پھر تقلید کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہر شخص نصوص کے معانی و احکام کے استنباط ک کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہر شخص نصوص کے معانی و احکام کے استنباط کے طریقوں سے واقف ہے...؟ مثلاً ایک شخص خرید و فروخت کے معاملے میں کچھ شرطیں رکھنا چاہتا ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر قرآن و سنت میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو بلکہ نصوص موجود ہیں مگر وہ شخص اجتہاد اور استنباط کی صلاحیت نہیں رکھتا نہ فقہ کے قواعد سمجھتا ہے، تو ان نصوص کے ہوتے ہوئے بھی وہ یہ طے نہیں کر سکتا کہ یہ شرطیں درست ہیں یا باطل اور معاملہ صحیح ہے یا فاسد، اسی طرح: وہ زمینیں جو مسلمانوں نے

مصنفِ رسالہ ائمہ کے ان اقوال کو جن میں انہوں نے دلیلِ شرعی کے مقابلے میں اپنے مذہب پر اصرار کرنے اور تعصب برتنے سے روکا ہے، اپنے اس بڑے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے، گویا وہ یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ ائمہ نے کہا کہ: جب دلیل ظاہر ہو جائے تو امام کی رائے نہ مانو" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی فقہی مذہب کی پابندی سرے سے ناجائز ہے، لیکن اگر ذرا گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کی بنیاد ہی کمزور دکھائی دیتی ہے۔

در حقیقت یہی وہ مقام ہے۔ جہاں رسالے کے مصنف نے متفقہ حقائق کو غلط مدعا کے ساتھ ملا دیا ہے، اس نے ان امور کے دلائل جن پر سب مسلمان متفق ہیں ان امور پر لاگو کر دیئے جن کا کوئی اہلِ اسلام قائل ہی

جنگ کے ذریعے حاصل کیں ان کے احکام پر قرآن وسنت میں صاف آیات اور روایات موجود ہیں لیکن میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ بے مذہبیت کے سب سے بڑے داعی جو خود کو سب سے زیادہ عالم سمجھتے ہیں اگر انہی نصوص سے اپنے طور پر حکم نکالنے کی کوشش کریں، تو یقیناً ان کے قدم ڈگمگانے لگیں گے اور وہ خود اپنے فہم کے گرد چکر کھانے لگیں گے، فقہ کے ہر باب میں اس طرح کے بے شمار جزوی مسائل موجود ہیں، پھر خجندی کے اس قول کا مطلب آخر کیا باقی رہ جاتا ہے کہ:

جہاں کتاب وسنت یا اقوالِ صحابہ موجود ہوں وہاں انہی کو اختیار کرنا واجب ہے اور علماء کے اقوال کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں۔

اگر یہی بات درست مان لی جائے تو پھر تیمم کی حاجت یعنی علماء کے اجتہاد سے استفادہ کس بات کے لیے باقی رہتی ہے؟ اب آیئے شیخ ناصر البانی کی وضاحت سنیں۔ جب ہم نے ان سے اس پر گفتگو کی تو انہوں نے کہا کہ: خجندی کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شخص خود نص سے حکم نکالے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص درجۂ اجتہاد کو پہنچ جائے تو پھر وہ براہِ راست نص پر عمل کرے۔ ہم نے کہا کہ: لیکن خجندی کے الفاظ تو عام ہیں،

اُس (خنجندی) نے خود لکھا ہے کہ حَيثُ وُجِدَ النَّصُّ.

یعنی جہاں کہیں بھی نص موجود ہو تو اس سے حکم لینا واجب ہے یہ عموم سب کو شامل ہے خواہ عالم ہو یا عامی،

مگر شیخ ناصر البانی نے اصرار کیا کہ یہ عموم مخصوص ہے، ہم نے عرض کیا کہ:

یہ تخصیص تمہارا اپنا گمان ہے کیونکہ عربی کے اصولِ لغت اور علمِ اصول میں کسی نے کبھی ایسا مخصّص نہیں بتایا کہ کسی کا کلام عموم پر ہو اور پھر کوئی دوسرا شخص اپنی طرف سے اس پر قید لگا دے۔

نہیں ! حالانکہ اگروہ تحقیق کے منہج پر چلتا تو سب سے پہلے محلِ اختلاف کو واضح کرتا یہ طے کرتا کہ اصل نزاع کہاں ہے اور کس بات پر سب متفق ہیں، پھر وہ اپنے دعوے کو اسی دائرے میں محدود رکھتا اور اس پر جتنا چاہے استدلال کرتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، لہٰذا اب ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی یہ کمی پوری کریں: اس لیے پہلے ہم محلِ نزاع [1] کو متعین کرتے ہیں، پھر ان تمام باتوں کو الگ رکھتے ہیں جن پر ہم اور تمام اہلِ اسلام متفق ہیں تاکہ ان میں وقت ضائع نہ ہو اور اصل علمی تحقیق میں کسی قسم کی اُلجھن یا اِنتشار پیدا نہ ہو۔

وہ امور جن میں اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں۔

کچھ باتیں ایسی ہیں جن پر مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں، لہٰذا انہیں اس بنیادی دعوے کی بحث سے الگ رکھنا چاہیے، جس خطرناک دعوے کو ثابت کرنے کے لیے رسالہ کے مصنف (خجندی) نے یہ کتابچہ لکھا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ :

جو شخص کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرتا ہے اس پر شرعاً یہ لازم نہیں کہ ہمیشہ اسی پر قائم رہے اور نہ ہی اس کے لیے کسی دوسرے مذہب کی طرف منتقل ہونا منع ہے، اس بات پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ایک مقلد کو اختیار ہے کہ وہ جس مجتہد (فقیہ) کی چاہے تقلید کرے بشرط یہ کہ وہ ان ائمہ کے نظریات اور دلائل کو سمجھتا ہو، مثلاً اگر وہ چاہے تو ایک دن امام ابو حنیفہؒ کی تقلید کرے اور دوسرے دن امام شافعیؒ کی اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ ہاں بعد کے کچھ زمانوں میں بعض لوگوں نے ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف منتقل ہونے کو برا سمجھا لیکن یہ ناجائز تعصب ہے جس کی غلطی پر تمام علماء کا اتفاق ہے، یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اصول کہ مقلد پر کسی ایک مذہب کی پابندی ضروری نہیں اس کے یہ

(1.) علمی مباحث میں سب سے پہلے محلِ نزاع کو متعین کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ اتفاقی امور پر بحث کر کے وقت اور فکر ضائع نہ ہو۔

معنی نہیں کہ مقلد کے لیے کسی خاص مذہب پر قائم رہنا منع ہے یعنی یہ کہنا درست ہے کہ پابندی فرض نہیں مگر یہ کہنا غلط ہو گا کہ پابندی حرام ہے،

دوسری بات یہ ہے کہ :

اگر کوئی مقلد کسی مسئلے پر خود غور کرے اس کے دلائل قرآن وسنت اور اصولِ فقہ سے سمجھ لے تو اب اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مسئلے میں اپنے امام کی تقلید نہ کرے، جب اسے خود تحقیق کرنے کی صلاحیت حاصل ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے علم کی روشنی میں فیصلہ کرے اس بات پر تمام علماء اور ائمہ مذاہب کا اتفاق ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے امام کی رائے کو اپنی تحقیق سے حاصل شدہ رائے پر ترجیح دے، اس مسئلے میں جسے اس نے اچھی طرح سمجھ لیا ہو اور اس کے دلائل کو جان لیا ہو،[1] اگرچہ بعد کے کچھ ادوار میں کچھ لوگ اس بات میں بھی تعصب کا شکار ہو گئے اور مسلمانوں کے اجماع سے ہٹ گئے حالانکہ یہ بھی فرقہ وارانہ تعصب کی ایک بدصورت شکل ہے جس کی نشاندہی اور اصلاح

---

[1] ۔ایسے شخص کو مجتہد فی المذہب کہا جاتا ہے، کیونکہ اصولِ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ بات لکھی ہے کہ اجتہاد جزوی طور پر بھی ممکن ہے، یعنی جو شخص اجتہاد کے تمام اصولوں اور شرائط کا ماہر ہو اور تمام فقہی مسائل میں رائے قائم کر سکتا ہو وہ مجتہد مطلق کہلاتا ہے، اور جو کسی ایک مسئلے میں اتنی مہارت حاصل کر لے کہ اس کے دلائل کو سمجھ سکے اور ان سے حکم اخذ کر سکے وہ مجتہد فی المذہب کہلاتا ہے، شیخ ناصر اس واضح حقیقت پر تعجب کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ایسا شخص صرف متبع کہلانا چاہیے،
انہوں نے لوگوں کو صرف دو طبقوں میں بانٹنے پر اعتراض کیا مجتہد اور مقلد، اور کہا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو چند مسائل میں تحقیق کر لیتے ہیں اور ان کے دلائل کو سمجھتے ہیں، مگر وہ نہ تو ائمہ اربعہ کے درجے کے مجتہد ہیں نہ عام مقلدین میں شامل ہیں لہٰذا وہ تیسرا طبقہ ہیں، لیکن ہم کہتے ہیں جیسا کہ تمام فقہاء اور اصولیوں کا اتفاق ہے: ایسا شخص اس مسئلے میں مجتہد ہے جس میں وہ اجتہاد کی سطح تک پہنچ گیا، اور باقی مسائل میں مقلد ہے، یہی مطلب ہے اس بات کا کہ :
اجتہاد اور تقلید دونوں تقسیم پذیر (جزوی) ہیں۔

ضروری ہے، اور یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اس بات کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ عام مقلد جو دلائل سے ناواقف ہو اسے تقلید چھوڑ دینے کی دعوت دی جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ :

تمام ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ) حق پر ہیں، یعنی ہر امام کا اجتہاد ایسا ہے کہ اگر وہ کسی اجتہادی مسئلے میں اللہ تعالیٰ کے حقیقی حکم تک نہیں پہنچ سکے تو وہ عند اللہ معذور و ماجور ہیں، کیونکہ ان پر لازم صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کریں جس پر ان کے علم و فہم نے انہیں پہنچایا، اسی بنا پر مقلد اگر کسی بھی امام کی پیروی کرے تو وہ دراصل حق کی پیروی کر رہا ہے اور ہدایت پر ہے، البتہ جب وہ کسی ایک امام کی اتباع اختیار کرے تو اسے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ باقی ائمہ خطا پر ہیں، ([1])

([1])۔ یقیناً ابتدائی زمانے کے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ شافعی کی نماز حنفی کے پیچھے اور حنفی کی نماز شافعی کے پیچھے درست ہے، یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہاں "نماز" کا لفظ عام (مطلق) طور پر استعمال ہوا ہے اور مطلق لفظ اپنے کامل مفہوم پر محمول ہوتا ہے، یعنی مراد وہ نماز ہے جس میں مقتدی کو یقین نہ ہو کہ اس کے امام نے کوئی ایسا کام کیا جو اس کے اپنے مذہب کے مطابق نماز کو باطل کر دیتا ہے، اس لیے اگر کسی شافعی کو معلوم ہو کہ اس کا امام (جو حنفی ہے) اپنی بیوی سے نکاحِ باطل کے باوجود نماز پڑھا رہا ہے تو یہ صورت اس مطلق نماز کے دائرے میں شامل نہیں اور اس اجماع کے اطلاق پر اعتراض نہیں بنتا،

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہا جائے کہ :

سب نے اتفاق کیا ہے کہ باغ میں نماز پڑھنا جائز ہے، اب اگر باغ غصب شدہ ہو تو یہ استثناء اس عمومی اجازت کو منسوخ نہیں کرتا، کیونکہ وہ کامل فرد کے مفہوم میں شامل نہیں، یہ اصول ہر اس شخص کو معلوم ہے جس نے اصولِ فقہ کی کسی کتاب میں "باب المطلق والمقید" کا مطالعہ کیا ہو، افسوس کہ اس وضاحت کے باوجود میری شیخ ناصر سے گفتگو طویل ہو گئی. اور وہ اس مفہوم کو سمجھنے پر آمادہ نہ ہوئے، بحث کے دوران وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ :

لفظِ مطلق اپنے اطلاق پر قائم رہتا ہے جب تک کوئی قید نہ آئے، گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ مطلق کا معاملہ عام لفظ کی طرح ہے حالانکہ ان دونوں کے مفہوم میں بڑا فرق ہے! اسی وجہ سے وہ میرے اس بیان پر معترض ہوئے کہ "امت کا اجماع ہے کہ مسلمان ایک

دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں" اور کہا کہ اس اجماع کی اطلاقی صورت درست نہیں، کیونکہ بعض فقہاء نے اختلاف کیا ہے جب مقتدی کو یقین ہو کہ امام نے اس کے مذہب کے مطابق کوئی مبطل کیا ہے، میرے اس وضاحتی اقرار کو شیخ ناصر نے نہ صرف اجماع کی خطرناک قید قرار دیا بلکہ اسے ایسا تضاد کہا جس سے میرے تمام دلائل بے معنی ہو گئے، اور یہاں تک کہا کہ میں گویا تعددِ محاریب اور تعددِ جماعتوں کا قائل بن گیا، اگرچہ میں نے بارہا اس خیال کی تردید کی اور ہمیشہ اعتدال کا مسلک اختیار کرنے کی تلقین کی، ناصر البانی نے اپنی کتاب "صفة صلاة النبي ﷺ" (ص 231) میں میرے متعلق لکھا کہ:

ڈاکٹر بوطی نے اپنی کتاب ۔لامذھبیۃ" میں دعویٰ کیا

کہ اُمت کا اجماع ہے کہ حنفی شافعی کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے، جب میں نے اس دعویٰ کی اطلاقی صورت کو غلط قرار دیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرا مطلب ہے بشرطِ صحتِ نمازِ امام عند المقتدی، یوں انہوں نے اس شرط کے ذریعے اپنے ظاہر کردہ اعتدال کو خود ہی منہدم کر دیا!. یعنی شیخ ناصر کے نزدیک اعتدال یہ ہے کہ مخالف مذہب کے امام کے پیچھے نماز ہر حال م امام کے پیچھے نماز ہر حال میں درست ہو چاہے امام نے ایسا عمل کیا ہو جو مقتدی کے مذہب کے مطابق نماز کو باطل کرتا ہے اور چاہے مقتدی کو اس کا علم ہو یا نہ ہو، ہم شیخ ناصر سے پوچھتے ہیں کہ:

اگر وہ کسی امام کے پیچھے نماز پڑھیں اور انہیں یقین ہو کہ امام کی جیب میں شراب کی بوتل ہے اور ان کے نزدیک الکحل نجس ہے، تو کیا وہ اس امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور اپنے اعتدال کو باقی رکھیں گے؟ یا اس اعتدالِ موہوم کو چھوڑ کر کسی اور جگہ نئی جماعت قائم کریں گے؟ ہمیں علم ہے کہ شیخ ناصر کئی مسلمانوں کے جنازوں میں شرکت سے بھی گریز کرتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ ان سے کوئی ایسا عمل صادر ہوا جسے وہ اپنے اجتہاد کے مطابق شرک یا کفر سمجھتے ہیں تو پھر کیا وہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے جس کے متعلق وہ سمجھتے ہوں کہ وہ کسی ایسے عمل میں مبتلا ہے جو اس کے نزدیک نماز کو باطل کرتا ہے؟ میں نے کوئی لفظی چالاکی نہیں کی تھی جب میں نے کہا کہ ائمہ اربعہ کا اجماع ہے کہ مسلمانوں کی نماز ایک دوسرے کے پیچھے درست ہے اگرچہ ان کے مذاہب مختلف ہوں، اور میں ایسا شخص نہیں جو علمی بحث میں وہ بات ظاہر کروں جس پر خود ایمان نہ رکھتا ہوں، اگرچہ انہوں نے مجھ پر یہی الزام لگایا، درحقیقت میرا موقف بالکل درست ہے اور ہر وہ شخص جو اصولِ فقہ کی تعبیرات سے واقف ہے اسے بخوبی سمجھ سکتا ہے، حقیقی اعتدال یہی ہے جسے ہمارے فقہاء نے بیان کیا ہے: کہ مسلمان کی نماز کسی بھی ایسے امام کے پیچھے درست ہے جو چاروں مذاہب میں سے کسی ایک کا پیرو ہو، بشرطیکہ مقتدی کو یقین نہ ہو کہ امام نے ایسا فعل کیا ہے جو اس کے مذہب میں نماز کو باطل کر دیتا ہے، البتہ اگر مقتدی کو یقین ہو کہ امام نے ایسا مبطل کیا ہے، تو اس کی اپنی نماز باطل ہو گی کیونکہ نماز کی صحت کا مدار مقتدی کے عقیدے پر ہے امام کے نہیں، مثلاً اگر شیخ ناصر کسی ایسے امام کے پیچھے کھڑے ہوں جس نے سورۂ فاتحہ میں بسم اللہ نہ پڑھی ہو اور ان کے نزدیک بسم

اسی لیے علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حنفی امام کے پیچھے شافعی کی نماز صحیح ہے اور شافعی امام کے پیچھے حنفی کی نماز بھی درست ہے۔ حالیہ دور میں بعض ملکوں اور کچھ لوگوں کے درمیان ایک رجحان ظاہر ہوا ہے جو اس متفق علیہ حق کے خلاف ہے، یہ دراصل تعصبِ بد (قبیح تعصب) کی نئی شکل ہے، جس کا دین میں کوئی جواز نہیں اور مسلمانوں کو اس سے ہر ممکنہ طریقے سے متنبہ کرنا ضروری ہے، مساجد میں متعدد محاریب بنانا اور ہر محراب کو کسی فقہی مذہب کے نام سے موسوم کرنا سب سے بدترین شکل ہے اس بے معنی اور غیر معقول فساد کی، اسی طرح بعض عوام یا بعض لوگ جو خود کو اہلِ علم ظاہر کرتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ مسجد میں جماعت قائم ہے تو وہ صرف اس لیے جماعت میں شامل نہیں ہوتے کہ امام ان کے مذہب سے تعلق نہیں رکھتا یہ لوگ مسجد کے ایک گوشے میں نماز پڑھتے ہیں۔ اپنے اپنے مذہبی امام کے انتظار میں، یہ سمجھ کر کہ ان کی نماز صرف اپنے امام کے پیچھے ہی درست ہو گی، یہ رویہ چاہے عوام میں ہو یا بعض علم کے مدعیوں میں دین کے کسی بھی اصول پر مبنی نہیں بلکہ اس کے برعکس ہر زمانے میں ائمۂ اربعہ اور علمائے امت کا اجماع رہا ہے کہ مسلمان کسی بھی امام کے پیچھے نماز ادا کر سکتے ہیں، جب تک انہیں یقین نہ ہو کہ امام نے کوئی مبطل (ناجائز یا باطل) عمل کیا ہے،

لوگوں کے اس رویے کی دو بنیادی وجوہات ہیں:

1 : بے جا تعصب جو دل میں بیٹھ گیا ہے،

اللہ فاتحہ کی آیت ہے اس کا ترک نماز کو باطل کرتا ہے تو ان کا اس امام کے پیچھے نماز نہ پڑھنا عدمِ اعتدال نہیں بلکہ عین اصول کے مطابق ہے، البتہ جس چیز کی تردید ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ صرف اس لیے جماعت سے الگ رہتے ہیں کہ امام ان کے مذہب کا نہیں، یہ سخت قابلِ مذمت تعصب ہے اور سلفِ صالحین کے کسی معتبر فقیہ نے ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا، حالانکہ انہی کے زمانے میں یہ اجماع پایا گیا تھا کہ مسلمانوں کی نماز ایک دوسرے کے پیچھے درست ہے، اگر شیخ ناصر یہ نسبت کسی فقیہ کی طرف کرتے ہیں تو لازم ہے کہ ان کے نام بھی ذکر کریں اور ان کے اقوال کی نشان دہی بھی کریں کہ وہ کہاں مذکور ہیں۔

2 : یامفاد پرستی،

کچھ لوگ یہ روایتیں وراثت میں حاصل کر چکے ہیں اور ان سے مالی یا سماجی فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ تینوں امور ایسے مسائل ہیں جن پر امت کا کامل اتفاق ہے ان میں ہم نہ کسی سے اختلاف کرتے ہیں اور نہ کسی نئے مدعی کے حق میں بات کرتے ہیں، علماء اور ائمہ رحمہم اللہ نے اپنی تحقیقات اور تصانیف میں ان کو واضح کیا ہے، صاحبِ رسالہ نے ابن القیمؒ، امام عز بن عبد السلامؒ، اور شاہ دہلویؒ کے جو اقوال نقل کیئے وہ دراصل انہی تین امور کے گرد گھومتے ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی ان امور کی مخالفت نہیں کی جن پر اہلِ علم کا اجماع ہے، اگر صاحبِ رسالہ اپنی تحقیق کو انہی امور تک محدود رکھتے اور انہی ائمہ کی طرح ان تعصبات کی مضر صورتوں کی نشاندہی کرتے تو ہم ان کے رسالہ کو دل کی گہرائی سے قبول کرتے نہ اس سے اختلاف ہوتا اور نہ انکار کی ضرورت رہتی، مگر انہوں نے ان نصوص کو اپنے مقصد سے ہٹا کر ایسے دعووں میں استعمال کیا جن کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا، انہوں نے ان دلائل کو بطور دلیل پیش کیا کہ کسی کے لیے کسی ایک فقہی مذہب کی پابندی جائز نہیں حالانکہ اصل نصوص صرف ان تعصبات (جن کا اوپر ذکر ہوا) کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں، اسی وجہ سے ان کے دلائل خود ان کے دعوے کے خلاف گئے۔ وہ حرمتِ تمذھب (کسی ایک مذہب کی پابندی) پر دلیل لانے کے لیے امام عز بن عبد السلامؒ کا حوالہ دیتے ہیں حالانکہ وہ خود شافعی المذہب تھے، پھر امام کمال بن الہمامؒ کا حوالہ دیتے ہیں جو حنفی المذہب تھے، ابن القیمؒ کا ذکر کرتے ہیں جو حنبلی المذہب تھے، اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا قول پیش کرتے ہیں جو حنفی المذہب تھے۔ یوں انہوں نے انہی ائمہ کے اقوال سے کسی ایک مذہب کی پابندی کی حرمت ثابت کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ خود اپنے مذہب سے وابستہ تھے۔

صاحب رسالہ کے نئے دعوے ان کے دلائل اور ان کا مدلل رد

اب جب ہم نے کتابچے کی ان تمام بحثوں کو جو اصل نزاع سے تعلق نہیں رکھتیں چھانٹ دیا اور ان عبارتوں کو بھی الگ کر دیا جنہیں مصنف نے محض مُتفقہ امور کے اثبات کے لیے پیش کیا جن پر سب کا اتفاق ہے کسی قسم کا کوئی خلاف نہیں، تو کتابچے کے مصنف کا ان سب پردے کے پیچھے ایک نہایت سنجیدہ اور نیا دعویٰ ابھر کر سامنے آتا ہے، جو دراصل مصنفِ کتابچے کا مرکزی مقصد ہے،

اور وہ دعویٰ یہ ہے کہ:

کسی بھی مسلمان پر جائز نہیں کہ وہ چاروں فقہی مذاہب میں سے کسی ایک کو اپنائے۔

مصنف کے نزدیک ایسا عمل اندھی تقلید اور کھلی گمراہی ہے اور وہ (مصنفِ کتابچہ) تقلیدِ شخصی کے مقلدین کو اس آیت کی تنبیہ میں شامل کرتا ہے جس بارے میں قرآن نے فرمایا:

جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ہر گروہ اپنے گروہ میں بٹ گیا۔ اب وقت ہے کہ ہم اس دعویٰ کی حقیقت کو بے نقاب کریں اور غور سے دیکھیں کہ اس کی دلیل اور بنیاد کیا ہے خاص طور پر اس وقت جب ہم نے اس کے گرد چھپی ہوئی پردہ پوشیوں کو ہٹا دیا ہے یعنی وہ تین متفقہ اصول جن کے ساتھ اس دعویٰ کا نہ کوئی قریبی تعلق ہے نہ کوئی بعیدی، لہٰذا اس دعویٰ کے حامیوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان متفقہ اصولوں کے دلائل کو اپنے نظریے کے لیے مستعار لیں یا ان سے اپنی دلیل کو تقویت بخشیں،

اب سوال یہ ہے کہ:

کتابچے کے مصنف نے اپنے اس دعویٰ کے حق میں کون سی دلیلیں پیش کی ہیں؟ تو لیجئے وہ دلائل اور انکی حقیقت آپ کے آگے پیشِ خدمت ہے۔

مصنفِ رسالہ کی پہلی دلیل:

کچھ لوگوں (مصنفِ کتابچہ اور ناصر البانی وغیرہ) کا دعویٰ ہے کہ اسلام محض چند مختصر اور آسان احکام سے زیادہ کچھ نہیں جسے ہر عام اعرابی یا مسلمان بآسانی انہیں سمجھ سکتا ہے، اس دعویٰ کے ثبوت میں بطورِ دلائل کے وہ احادیث پیش کرتے ہیں جو صفحہ (5و6) پر موجود ہیں ([1]) اور یہ کہ مذاہب صرف اہل علم کے اپنے فہم اور آراء ہیں جو بعض مسائل میں ان کے خیالات کی عکاسی کرتی ہیں، اور یہ آراء اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کسی پر واجب نہیں کی گئیں،

ہم کہتے ہیں کہ :

اگر یہ بات درست ہوتی کہ احکام اسلام صرف انہی محدود امور تک محدود ہیں جو رسول ﷺ نے کسی اعرابی کو بیان کیے تو پھر صحاح و مسانید کی کتابیں ہزاروں احادیث سے لبریز نہ ہوتیں جو انسانی زندگی

([1]) ۔ ناصر الدّین الألبانی و دیگر منکرین تقلید وغیرہ اپنے اس دعویٰ (کہ اسلام کی تعلیم محض چند بنیادی عبادات یا ارکان تک محدود ہے) کے ثبوت میں اس طرح کی روایات کو پیش کرتے جن میں اجمالاً اسلامی تعلیمات ذکر ہوتا ہے، مثلاً ایک روایت میں بیان ہے کہ ایک اعرابی صحابی رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرتا ہے کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جس کے ذریعے میں جنت میں داخل ہوں، جس پر رسول اللہ ﷺ نے اسے صرف توحید، نماز، زکاۃ اور روزہ کے بنیادی ستون بتائے۔ (صحیح مسلم، کتاب الِایمان، حدیث نمبر 14) ایسے ہی ایک اور روایت میں بھی اعرابی نے اسی طرح کی رہنمائی طلب کی، اور رسول اللہ ﷺ نے اسے بنیادی ارکان کے احکام سکھائے۔ (صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1396) اسی طرح ایک اعرابی صحابی نے سوال کیا کہ مجھے جنت کی راہ دکھائیں تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بنیادی عبادات اور صلہ رحمی کی تعلیم دی۔ (صحیح مسلم، کتاب الِایمان، حدیث نمبر 12)
اس طرح کی روایات کو بنیاد بنا کر بعض غیر مقلدین یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ اسلام صرف چند بنیادی احکام پر مشتمل ہے اور دیگر تفصیلی عبادات، احکام و معاملات سب فقہاء و مجتہدین کی ذہنی اختراع و غیر ضروری ہیں۔ یہاں مصنفؒ اسی غلط مؤقف کی تردید فرمارہے ہیں۔ (مترجم)

کے ہر گوشے میں اسلامی اصولوں اور فرائض کی تفصیل بیان کرتی ہیں، نہ ہی یہ ممکن ہوتا کہ نبی ﷺ کئی دنوں تک تھکن کے باوجود کھڑے رہ کر قبیلہ ثقیف کے وفد کو اسلام کے احکام اور اللہ کی طرف سے دی گئی ذمہ داریوں سے روشناس کراتے، اسلام اور اس کے ارکان کی تعلیم لوگوں تک پہنچانا ایک بات ہے اور انہیں عملی طور پر ان ارکان پر عمل کرنا سکھانا بالکل دوسری بات، پہلا کام چند لمحوں میں ممکن ہے لیکن دوسرا کام صبر، مشق اور تربیت کا متقاضی ہے،

اسی لیے وہ مسلم وفود جو چند لمحوں میں اسلام کے ارکان کی جامع سمجھ حاصل نہیں کر سکتے تھے ان کے ساتھ رسول ﷺ کے منتخب صحابہ کرام بھیجے جاتے تاکہ انہیں اسلام کا ہر چھوٹا بڑا حکم اور دین داری باریک بینی سے سکھائیں چناچہ خالد بن الولیدؓ کو اسی مقصد کے لیے نجران بھیجا گیا اور حضرتِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو۔ یمن کی طرف، اسی طرح ابو موسیٰ الاشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو بھی یمن میں بھیجا گیا اور عثمان بن ابی العاصؓ کو قبیلہ ثقیف کی جانب روانہ کیا گیا یہ سب حضرات اس لیے بھیجے گئے کہ وہ ان لوگوں کو دین [1] سکھائیں جو اس اعرابی کی طرح تھے جسے صاحبِ رسالہ نے مثال کے طور پر پیش کیا، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ

([1])۔ استاد ناصر نے خجندی صاحب کے بارے میں معذرت کا اظہار کیا ہے،

ان کا کہنا ہے کہ خجندی چونکہ بخارا کے رہنے والے اور غیر عرب تھے، اس لیے ان کی زبان میں کچھ کمزوری تھی مگر اس کے باوجود انہوں نے جو کچھ لکھا وہ قابل قدر ہے اور ہمیں چاہیے کہ ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھیں، ہمارے لیے حیرت کی بات یہ ہے کہ زبان کی معمولی کمزوری یا غیر عربی انداز کو بنیاد بنا کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے الٹا مفہوم بیان کر دیا، ہم نے خجندی کی تحریر کا بغور مطالعہ کیا ہے لیکن ہمیں کہیں بھی ایسی بات نہیں ملی جو زبان کی خامی یا غیر عربی انداز سے بگڑی ہو، اگر استاد ناصر کا یہ اصول درست ہے کہ کسی کی عبارت میں زبان کی کمزوری دیکھ کر اسے معذور سمجھنا چاہیے، تو کیا وہ یہی رویہ اُن غیر عرب صوفیوں کے ساتھ بھی اختیار کریں گے جن کی باتوں میں کبھی کبھی عجمی لہجے کے اثرات یا مبالغے پائے جاتے ہیں؟ کیا وہاں بھی وہ اسی حسنِ ظن کے اصول کو لاگو کریں گے جس کی دعوت یہاں دیتے ہیں؟

رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے چند باتیں سن کر فوراً اسلام سمجھ گیا تھا پھر بھی ان صحابہ کرام کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ان لوگوں کو اسلامی شریعت کے احکام کی تفصیلات سکھائیں، اور وہ تعلیم ورہنمائی جاری رکھیں جو خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ اور یہ تمام مسائل واحکام خواہ ان کا ماخذ براہِ راست کتاب اللہ کی کوئی صریح نص ہو یا رسول اکرم ﷺ کی سنتِ مبارکہ سے ماخوذ ہوں یا پھر امت کے اجماع سے ثابت ہوں، یا کسی اصلی شرعی اصول پر مبنی قیاس سے حاصل کیے گ ئے ہوں، یہ سب دراصل اسلام ہی کے دل سے پھوٹنے والے سرچشمے ہیں، اللہ تعالیٰ کا حکم ان ہی ذرائع میں سے کسی ایک کے ذریعے معلوم ہوتا ہے لیکن ان ذرائع سے احکام اخذ کرنے کے لیے کچھ مخصوص شرائط، مراتب اور اصول مقرر ہیں جن کے مطابق ان سے استنباط اور سمجھ حاصل کی جاتی ہے، اب سوچنے کی بات ہے کہ جب یہ سب کچھ اسلام ہی کے بنیادی اصولوں سے لیا گیا، تو پھر اسلام کو ان احکام سے جو ائمہ اربعہ اور ان جیسے دیگر ائمہ نے انہی اصولوں سے اخذ کیے کیونکر الگ کیا جاسکتا ہے؟ پھر یہ صاحبِ رسالہ کیسی بات کہتا ہے کہ:

مذاہب دراصل اہلِ علم کی آراء اور ان کے بعض مسائل میں اجتہادات ہیں اور ان آراء واجتہادات کی پیروی کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے کسی پر کوئی وجوب نہیں رکھا، کیا یہ وہی بات نہیں جو اسلام کے دشمن مشہور جرمن مستشرق شاخت نے ضد اور عناد کے ساتھ کہی تھی؟

وہ کہتا ہے کہ:

فقہِ اسلامی جو ائمہؑ مذاہب نے مرتب کی درحقیقت چند قانونی اذہان کی پیداوار ہے جنہوں نے اپنی اس علمی کاوش کو کتاب وسنت کی طرف منسوب کردیا۔

اور یہی اس کی وہ کتاب ہے جو آج بھی یورپ کی جامعات میں اسلامی فقہ پڑھانے کے لیے سب سے پہلے پڑھائی جاتی ہے، اب اگر شاخت اور صاحبِ رسالہ (خجندی) دونوں کی بات درست مان لی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم پر شرعاً احکامِ شخصیہ (یعنی معاملاتِ خانہ داری، نکاح، طلاق وغیرہ کے احکام) کی پابندی بھی لازم نہیں رہتی کیونکہ ان کے بیشتر احکام بھی علما کی آراء اور اجتہادات پر مبنی ہیں۔

لہذا اگر ان اجتہادات اور آراء کو، جنہیں فقہی مذاہب میں بیان کیا گیا ہے، ہم محض علما کی فہم و آراء قرار دیں اور یہ کہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کسی کو ان کی اتباع کا مکلف نہیں بنایا جیسا کہ صاحبِ رسالہ کا بیان ہے تو لازم آتا ہے کہ ہم شرعاً اس قانونِ مدنی (اسلامی دیوانی قانون) کے التزام کے بھی پابند نہ رہیں جو کل کو علما کی ایک کمیٹی تیار کرے، کیونکہ اس کے اکثر احکام بھی تو انہی آراء اور اجتہادات پر مشتمل ہوں گے جن کے بارے میں کہا گیا کہ؛

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کسی پر ان کی پیروی لازم نہیں کی۔ پھر اس کے بعد ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی؟ اور اگر یہی بات درست ہے تو ہمیں اپنی اس غلطی سے بیدار ہو جانا چاہیے اور اعلان کر دینا چاہیے جیسا کہ شاخت چاہتا ہے کہ "اسلام صرف ایک دین ہے۔ ریاست یا نظامِ حکومت نہیں" حالانکہ نبی کریم ﷺ تو اپنے صحابہ میں سے ایسے افراد کو جو حفظ، فہم اور استنباط میں نمایاں ہوتے، مختلف قبائل اور علاقوں کی طرف بھیجتے تھے تاکہ وہ وہاں کے لوگوں کو اسلام کے احکام اور حلال و حرام کے مسائل سکھائیں، پوری امت کا اس پر اجماع ہے۔ کہ جب ان صحابہ کرام کو کتاب و سنت کا صریح حکم نہ ملتا تو وہ اجتہاد کرتے اور رسولِ اکرم ﷺ ان کے اجتہاد کو درست قرار دیتے،

چنانچہ ابوداود اور ترمذی نے شعبہؒ سے روایت کیا ہے کہ؛

جب نبی اکرم ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا:

معاذ جب تمہارے سامنے کوئی معاملہ پیش ہو تو تم کیا کروگے ؟انہوں نے عرض کیا : میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا آپ ﷺ نے فرمایا : اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ؟انہوں نے عرض کیا : تو سنتِ رسول ﷺ کے مطابق فیصلہ کروں گا آپ ﷺ نے فرمایا : اگر سنت میں بھی نہ پاؤ؟انہوں نے عرض کیا : تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہیں کروں گا، یہ سن کر رسولِ اللہ ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جو خود رسول اللہ ﷺ کو پسند ہے۔ [1]- یہ سب دراصل ان بلند مرتبہ صحابہ کرامؓ کے اجتہادات اور فہمِ عمیق تھے، جن پر وہ عملاً فیصلے صادر کرتے اور انہی بنیادوں پر امت کے معاملات چلاتے تھے اور یہ سب کچھ نبی اکرم ﷺ کی موجودگی میں آپ ﷺ کی منظوری، سکوتِ رضامندی اور واضح تائید کے ساتھ ہوتا رہا،

اب ذرا انصاف کیجیے :

کیا یہ کہنا روا ہے کہ ان اجتہادات کی اتباع اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے لازم نہیں کی ؟ یہ دعویٰ صرف علمی بے سمجھی نہیں بلکہ نقلی امانت سے بھی انحراف ہے، اسلام کے احکامات اتنے معمولی اور محدود نہیں جتنا کہ بعض معترضین (خُجندی والبانی جیسے منکرینِ تقلید) نے اپنے مختصر رسائل میں باور کرانے

([1])۔ یہ حدیث شعبہ نے ابو عون سے اور انہوں نے حارث بن عمرو سے روایت کی اور ان سے معاذ بن جبلؓ کے چند اصحاب نے نقل کی۔ ابن القیمؒ نے اعلام الموقعین (202/1) میں فرمایا: اگرچہ اس میں راویوں کے نام صراحت سے مذکور نہیں، مگر چونکہ وہ سب حضرت معاذؓ کے اصحاب میں سے ہیں، اس لیے یہ بات کسی ضعف کا سبب نہیں بنتی بلکہ یہ اس کے انتشار و شہرت پر دلالت کرتی ہے اور یہ اس بات سے زیادہ معتبر ہے کہ اگر یہ ایک ہی شخص سے منقول ہوتی۔ پھر معاذؓ کے اصحاب میں کوئی کذاب یا مجروح راوی نہیں چنانچہ بعض ائمہ نے فرمایا: جب تم کسی روایت کی سند میں شعبہ کو دیکھو تو اسے مضبوطی سے تھام لو۔ ابو بکر بن الخطیب نے کہا: یہ روایت عبادہ بن نسی کے واسطے سے عبدالرحمٰن بن غنم سے بھی مروی ہے اور اس کی سند متصل اور ثقہ راویوں پر مشتمل ہے۔ اہلِ علم نے اسے نقل کیا اور اس سے حجت پکڑی جس سے ثابت ہوا کہ یہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہے۔

کی کوشش کی ہے کہ گویا دین کے تمام مسائل چند ظاہری نصوص سے بلاواسطہ حل ہو جاتے ہیں، اور اہلِ علم کے اجتہاد یا فہم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ اپنے دائرہ و وسعت میں بے پایاں ہے، اس نے انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط کر رکھا ہے خواہ وہ فرد کی نجی زندگی کے مسائل ہوں یا اجتماعی نظامِ زندگی کے اصول و تفصیلات اور یہ سب کچھ ہر زمانے، ہر ماحول اور ہر تغیر میں اپنی راہنمائی کی قوت رکھتا ہے، یہ تمام احکام بہر حال کتاب و سنت ہی سے ماخوذ ہیں کبھی ان کے ظاہرِ نصوص سے براہِ راست اور کبھی اجتہاد، غور و استنباط کے وسیلے سے، چنانچہ جس مسلمان نے جس بھی معتبر طریقے سے شرعی حکم تک رسائی حاصل کی وہی اس کے حق میں اللہ کا حکم ہے اور اس کے لیے اس سے رو گردانی کرنا روا نہیں، اسی طرح اگر وہی مجتہد کسی دوسرے مسلمان کو اسی فہم و استنباط کی بنیاد پر فتویٰ دے تو وہ بھی فتویٰ لینے والے کے لیے اللہ کا حکم ہو گا، اب اگر یہ اصول تسلیم نہ کیا جائے تو لازم آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وہ تمام تعلیماتی و دعوتی بعثتیں جن کے ذریعے آپؐ نے اپنے اصحابؓ کو مختلف علاقوں اور قبائل کی طرف بھیجا، (تاکہ وہ وہاں کے لوگوں کو دین سکھائیں اور فتوے دیں) سب کی سب بے مقصد ہو کر رہ جائیں اور یہ کہنے کی گنجائش پیدا ہو کہ:

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں تمہارے فہم و اجتہاد کی پیروی کا پابند نہیں کیا!

یہ بات نہ صرف نقلاً باطل ہے بلکہ عقلاً بھی مضحکہ خیز ہے کیونکہ اگر ہر شخص اپنے فہم پر اکتفا کرنے لگے اور صحابہؓ و ائمہ کے اجتہاد سے بے نیاز ہو جائے تو امت کے لیے نہ شریعت باقی رہے نہ وحدتِ فہم۔

مصنفِ کتابچہ کی دوسری دلیل

اسلام پر ثابت قدم رہنے کی بنیاد دراصل قرآن وسنت پر تمسک میں ہے کیونکہ یہ دونوں معصوم ہیں اور خطا سے پاک ہیں البتہ ائمہ مذاہب کی پیروی معصوم کی اقتداء سے غیر معصوم کی پیروی کی طرف منتقل ہو جانا ہے۔ [1](خجندی: ص8، 12)

(1)۔ ہم نے شیخ ناصر سے دریافت کیا کہ وہ خُجندی کے اس قول کو کس طرح سمجھتے ہیں جس میں وہ ائمہ کے مذاہب کو مقابل قرار دیتا ہے اُس کے جسے وہ مذہبِ رسول ﷺ کہتا ہے اور اس بات پر اعتراض کرتا ہے کہ:

الحق المذهب الواجب الذهاب إليه والاتباع له هو مذهب سيدنا محمد ﷺ.

اس پر شیخ ناصر نے کہا کہ:

یہ بات درست ہے کیونکہ ائمہ کے تمام مذاہب حق نہیں ان کے اجتہادات میں خطا کا امکان ہے جبکہ نبی ﷺ کی تعلیم میں کوئی خطا نہیں۔ ہم نے کہا کہ:

اجتہاد کے نتائج خواہ وہ صواب ہوں یا خطا بہر حال دین کا حصہ ہیں کیونکہ اس پر اجر ہے اور جب تک مجتہد کو اپنی خطا کا شعور نہ ہو اس کے لیے اسی پر عمل کرنا واجب ہے۔ لیکن وہ شخص (شیخ ناصر) اس پر مصر رہا کہ اگر اجتہاد خدا کے علم میں موجود حق سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو وہ دین میں شامل نہیں، اس موقع پر حاضرین میں سے ایک بزرگ، استاذ شیخ احمد رافت اکبازلی نے فرمایا کہ: کیا اجتہاد دین میں شامل ہے یا نہیں؟ شیخ ناصر نے کہا: ہاں، دین میں شامل ہے۔ استاذ نے فرمایا کہ:

پھر یہ کیسا اجتہاد ہے جو دین میں شامل ہے مگر اس کے نتائج دین میں شامل نہ ہوں؟ یہاں ایک علمی تضاد واضح ہوتا ہے اور وہ اصل قاعدے «لازم المذهب ليس بمذهب» کو کچھ زیادہ ہی حرفی انداز میں لے لیتے ہیں، اصل قاعدے کے مطابق:

جب کسی امام کا مذہب معروف ہو اور اس کے مذہب سے کوئی لازمی نتیجہ نکلتا ہو تو صرف اس لازمی نتیجے کی بنیاد پر اسے امام کا مذہب نہیں کہا جائے گا کیونکہ ممکن ہے امام کو اس لازمی نتیجے کا شعور ہی نہ ہو یا وہ اسے درست نہ سمجھتا ہو، اس لیے احتیاط کا تقاضا ہے کہ کسی امام کی طرف صرف وہی بات منسوب کی جائے جس کا اس نے صراحت سے اظہار کیا ہو،

مثال کے طور پر:

معتزلہ کہتے ہیں کہ اشیاء میں حسن وقبح ذاتی طور پر موجود ہیں اور عقل ان کا ادراک کر سکتی ہے،

اب ہم (خجندی کی) اس عجیب و غیر متوازن (دوسری دلیل) پر تبصرہ کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ :

آخر وہ کون لوگ ہیں جنہیں آپ اس دلیل سے مخاطب کرتے ہو اور جن پر اس استدلال کو نافذ کرنا چاہتے ہو؟ اگر آپ کا خطاب اُن اہلِ علم سے ہے جنہیں کتاب و سنت سے براہِ راست احکام سمجھنے کی قدرت حاصل ہے، اور وہ قیاس کے ذریعے مسائل اخذ کر سکتے ہیں بغیر کسی مفتی یا امام کے واسطے کے تو آپ کا

اہلِ سنت والجماعت نے کہا: اگر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ اشیاء کی صفات بذات خود حسن و قبح رکھتی ہیں تو یہ عقیدہ خدا کی خالقیت کے تصور سے متصادم ہے اور بالاتفاق کفر ہے، البتہ ہم معتزلہ کو اس لازمی نتیجے کی بنیاد پر کافر نہیں کہتے کیونکہ ممکن ہے وہ اس لزوم سے بے خبر ہوں یا اسے باطل سمجھتے ہوں، ہاں وہ خود اس لازوم کو تسلیم کرتے تو تب یہ ان کا مذہب شمار ہوتا مگر یہ نسبت لزوم کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کے اقرار کی بنیاد پر ہوگی، لیکن شیخ ناصر کا تصور یہ تھا کہ اس قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کسی مذہب کو مان سکتا ہے مگر اس کے لازمی نتیجے کو نہیں مان سکتا خواہ وہ خود اس لزوم کو جانتا اور تسلیم بھی کرتا ہو! اسی لیے ان کے نزدیک یہ بالکل درست ہے کہ وہ اجتہاد کو دین میں شامل مانیں اور ساتھ ہی کہیں کہ اجتہاد کا نتیجہ اگر خطا ہو تو وہ دین میں شامل نہیں، یہاں ایک اہم علمی تنقید کی جا سکتی ہے کہ : یہ موقف اصولی لحاظ سے غیر مستحکم ہے، کیونکہ دین میں شامل اجتہاد اور اس کے نتائج کے درمیان اس طرح کا فرق برقرار رکھنا علمائے کرام کے اجماع کے منافی ہے، آخر کار طویل مناقشے کے بعد انہوں نے تسلیم کیا کہ : اجتہاد کی خطا بھی دین کا حصہ ہیں جب تک مجتہد اپنی خطا سے بے خبر ہو اور اس پر اصرار نہ کرے، ہم نے کہا کہ : پھر خجندی کا یہ قول کہ ائمہ اربعہ کے تمام مذاہب حق نہیں کہاں رہتا ہے حالانکہ کسی امام نے اپنی خطا پر اصرار نہیں کیا؟

اس نے اپنا موقف بدل کر کہا:

خجندی کا مقصد ائمہ نہیں بلکہ ان کے متبعین ہیں جو امام کی خطا دیکھ کر بھی تقلید کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ خجندی کو ہر قیمت پر معصوم دکھایا جائے تاکہ وہ ایک علامہ کے منصب پر قائم رہیں اور ان کی تحریریں عوام میں اب بھی قابلِ استفادہ سمجھی جائیں۔ اور پھر آپ خود فیصلہ کیجیے کہ : اگر یہ رویہ تعصب کی بدترین شکل نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ وہی اندھی تقلید ہے جسے دوسروں میں تنقید کے طور پر دیکھا جاتا ہے مگر یہاں خود اسے مشروع ثابت کیا گیا ہے۔

استدلال درست ہے کیونکہ ایسے (مجتھد) شخص کے لیے ائمہ کے اقوال کی تقلید بے معنی ہے، لیکن یہ صورتِ حال اصل نزاع کے دائرے سے باہر ہے جیسا کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں، امتِ مسلمہ میں نہ قدیم زمانے میں اور نہ آج تک کوئی شخص اس بات میں آپ سے اختلاف نہیں کرے گا، البتہ اگر آپ ایسے عام لوگوں کو مخاطب کر رہے ہو جو اجتہاد، استنباط، یا دلائلِ شرعیہ کے معانی و مفاہیم کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو پھر آپ کی یہ بات واقعی قابلِ تعجب بلکہ بے معنی ہے کیونکہ اس کا کوئی صحیح مفہوم بن ہی نہیں سکتا، حقیقت یہ ہے کہ کلامِ الٰہی میں معصوم مفہوم وہی ہے جو خود اللہ تعالیٰ کی مراد ہو اور سنتِ نبوی میں معصوم فہم وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی نیت و ارادہ سے مطابقت رکھتا ہو، باقی رہی بات انسانوں کے فہم و تعبیر کی، تو وہ کبھی معصوم نہیں ہو سکتی چاہے وہ مجتہد ہوں، عالم ہوں یا عامی، (الّا یہ کہ کسی نص کا معنی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہو اور اسے سمجھنے والا عربی زبان میں پختہ فہم رکھتا ہو تو ایسی صورت میں خطا کا احتمال ختم ہو جاتا ہے۔) اور جب کتاب و سنت سے استفادہ کا واحد ذریعہ فہم ہے اور یہ فہم بذاتِ خود غیر معصوم ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ :

آخر عامی کے فہم اور مجتہد کے فہم میں فرق کیا رہا؟ اور پھر عامی کو تقلید چھوڑنے کی دعوت اس بنیاد پر دینا کہ "قرآن تو معصوم ہے اور امام معصوم نہیں" یہ استدلال حقیقت میں سفسطائی مغالطہ کے سوا کچھ نہیں، کیا اگر عامی کے لیے معصوم فہم حاصل کرنا ممکن ہوتا تو امت میں کبھی عالم، عامی، مقلد اور مجتہد کے مراتب قائم ہوتے؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہی امتیاز تو شریعت کی حکمت ہے جس نے ہر طبقے کے لیے حد مقرر کی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صاحبِ رسالہ کے ذہن میں یہ گمان ہے کہ گویا ائمہ کے مذاہب نے اپنے اجتہادات کسی اور چشمۂ علم سے لیے ہیں جو کتاب و سنت سے الگ ہیں گویا یہ مذاہب رسول اللہ ﷺ کے طریقے سے ہٹ کر کوئی نئی راہ ہیں جو طریقہِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ کرنے کے لیے وجود میں آئیں ہیں!

چنانچہ وہ اپنے متاثرین کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ :

چونکہ ائمہ کے مذاہب معصوم نہیں اس لیے صرف نبی ﷺ کا طریقہ اپنایا جائے۔ لیکن غور کیجیے کیا کبھی کسی امام نے دعویٰ کیا کہ وہ نبی ﷺ کے طریقے سے الگ کوئی مذہب پیش کر رہا ہے؟ قسم بخدا! اگر تم ان کی دلیل پر بار بار غور کرو تو تمہیں اس کے سوا کوئی مفہوم نہیں ملے گا کہ مصنف نے ائمہ کی فقہی کاوشوں کو دینِ نبوی کے مقابل میں ایک متوازی نظام سمجھ رکھا ہے اور یہی اس کے فہم کی سب سے بڑی لغزش ہے۔

تیسری دلیل

وہ (خجندی) آگے چل کر تیسرا استدلال پیش کرتا ہے کہ:

قبر میں انسان سے کسی مذہب یا طریق کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ (ص ۱۰)

یہ استدلال دراصل اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ صاحبِ رسالہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان پر جو واجبات عائد ہیں ان کی بنیاد قبر کے سوالات پر ہے، یعنی جو چیز قبر میں پوچھی جائے وہ واجب ہے اور جس کا سوال نہ ہو وہ غیر واجب یا غیر مشروع،

لیکن میں حیران ہوں کہ:

کیا کسی عقیدہ کی کتاب سے یہ امر ثابت ہے کہ فرشتے مردے سے اس کے قرضوں، مالی حقوق، ناجائز بیوع، غلط معاملات، اہل و اولاد کی تربیت میں کوتاہی یا وقت کے ضیاع کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ صاحبِ رسالہ کا میزانِ شریعت قبر کے سوالات ہیں جو کہ عقل و نقل

دونوں کے اعتبار سے انتہائی ناقص پیمانہ ہے۔ لیکن اگر واقعی کوئی معتبر نص موجود ہو جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ قبر میں منکر نکیر مردے سے ایسے تفصیلی سوالات کریں گے،

مثلاً یہ کہ تم نے امام شافعیؒ کی تقلید کیوں کی؟ خود اجتہاد کیوں نہ کیا؟ ایک ہی امام کے پیچھے کیوں جمے رہے اور کیوں اپنی رائے کو اس کے قول سے بدلنے یا موڑنے کی کوشش نہ کی؟ تو پھر بسم اللہ، ہم بھی کہہ دیتے ہیں کہ:

اگر واقعی ایسا ہے تو پھر میں گواہی دیتا ہوں کہ اس رسالے کے مصنف کا موقف درست و برحق ہے اور ہم باقی تمام محققین و علما خطا پر تھے، جنہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ قبر کے سوالات صرف بنیادی عقائدِ اسلام کے چند مخصوص پہلوؤں تک محدود ہیں جیسا کہ صحیح احادیث میں واضح طور پر مذکور ہے، ورنہ تو لازم آئے گا کہ فرشتوں کا کام قبر میں مردے سے تفصیلی محاسبہ کرنا ہو گویا وہ دار الجزاء کا ایک مقدمہ قبر ہی میں کھول دیں حالانکہ شریعت کی کسی دلیل سے یہ مفہوم ثابت نہیں، تاہم میں اب بھی وہی بات دہراتا ہوں جو جملہ علما و ائمہ فرماتے آئے ہیں کہ دنیا میں بندۂ مؤمن پر جو ذمہ داریاں عائد ہیں وہ ان چند سوالات سے کہیں زیادہ وسیع اور متنوع ہیں جن کا سامنا قبر میں ہوگا، یہی وجہ ہے کہ یہ تیسری دلیل بھی جس پر مصنف نے اعتماد کیا ہے کسی واضح اور معقول مفہوم سے خالی ہے، ہاں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس کے نزدیک ائمہ کے فقہی و اجتہادی مذاہب کتاب و سنت سے احکام کے استنباط میں نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کے مکتب کے مقابل ہیں تو پھر یقیناً اس کے لیے یہ بات معنی رکھتی ہے، یعنی اس کے زعم میں گویا ائمہ اربعہ اور دیگر مجتہدین، رسول اللہ ﷺ کے ہم رتبہ حریف ہیں (معاذ اللہ) اور اسی لیے قبر میں فرشتے بندے سے اس کے موقف کے بارے میں سوال کریں گے یعنی اس نے محمد ﷺ کو مانا یا نہیں؟

اور ظاہر ہے کہ وہ فرشتے کسی ایسے مقابلہ کرنے والے مذہب کے بارے میں سوال نہیں کریں گے جو بعد کے ادوار میں نمودار ہوئے اور اپنے پیروکاروں میں رائج ہوئے، قاریِ محترم سے گزارش ہے کہ یہ

نہ سمجھے کہ میں مصنف کا تمسخر اڑارہاہوں ہر گز نہیں، میں وہی بیان کررہاہوں جو اس کے کلام سے ہر سنجیدہ قاری بخوبی سمجھتاہے بلکہ خود مصنف نے اپنے بیان سے یہی مفہوم واضح کردیاہے جب وہ کہتاہے کہ:

جان لو کہ برحق اور واجب الاتباع مذہب دراصل سیدنا محمد ﷺ کا مذہب ہے وہی سب سے بڑے امام ہیں جن کی اتباع فرض ہے پھر ان کے خلفائے راشدین کا مذہب ہے ان کے علاوہ کسی شخص کی اتباع کا ہمیں حکم نہیں دیا گیا،

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا) (الحشر:7)

اور نبی ﷺ نے فرمایا: تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے۔(ص12)

اب ذرا غور فرمایئے کیا یہ جملے خود اس بات کی شہادت نہیں دیتے کہ مصنف کے نزدیک تاریخِ اسلام میں مختلف مذاہب پیدا ہوئے جن میں ہر ایک نے خود کو حق کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا اور ان سب میں سے صرف محمد ﷺ کا مذہب برحق اور باقی سب باطل ہیں؟

لیکن قارئینِ گرامی! اگرچہ آپ کا مطالعہ تاریخِ تشریع میں زیادہ نہ ہو کیا اتنی بنیادی حقیقت بھی آپ سے مخفی رہ سکتی ہے؟ کیا واقعی ائمہ اربعہ کے فقہی مسالک اور زید بن ثابتؓ، معاذ بن جبلؓ یا عبداللہؓ بن عباسؓ کے فہمِ شریعت میں ایسا کوئی فرق تھا کہ وہ ایک دوسرے کے مقابل قرار دیے جائیں؟ یا کیا فرق ہے ان ائمہ اربعہ اور ان اکابر اہلِ علم کے درمیان جنہوں نے عراق میں مکتبِ رائے اور حجاز میں مکتبِ حدیث کی بنیاد رکھی؟ ان دونوں علمی رجحانات کے اصل ستون تو صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ تھے ان کے بھی متبعین تھے اور ان کے بھی! پھر کیا اس رسالے کے مصنف کا یہ گمان ہے کہ یہ سب درجنوں مذاہب گویا رسول اللہ ﷺ کے مذہب کے مخالف اور معارض بن کر آئے؟ یا وہ یہ کہنا چاہتاہے کہ ملتِ اسلامیہ سے باہر جو باطل فرقے ہیں وہ

یہی چار فقہی مذاہب ہیں اور ان سے پہلے جو اجتہادات و آرا تھیں وہ سب حق و صداقت کی بنیاد پر تھیں گویا نبی ﷺ کے مذہب کے مساوی درجے کی حامل؟

مجھے معلوم نہیں کہ وہ ان دو میں سے کس موقف کا قائل ہے مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دونوں میں سے کوئی بھی موقف علمی اعتبار سے باطل اور فکری لحاظ سے غیر متوازن ہے ان میں سے بہتر خیال کیا جانے والا قول بھی دراصل علمی افتراء ہے، اللہ کی پناہ !

کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ، تابعین یا مجتہدین کے اجتہادات نبی کریم ﷺ کی لائی ہوئی وحی کے مقابل میں کوئی نیا مذہب بن گئے؟ ان کے اختلافات تو دراصل اجتہادی زاویوں اور نصوص کے فہم میں تفاوت کے مظاہر تھے نہ کہ مقابلہ آرائی یا مزاحمت کے، یہ کہنا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے حریف بنے ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ مفسرینِ قرآن ایک دوسرے کے مخالف قرآن لے کر آئے حالانکہ سب کا مقصود ایک ہی تھا:

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد و مراد کو زیادہ واضح اور زیادہ درست انداز میں سمجھنا، یہی حقیقت ہے جسے نہ سمجھنے سے صاحبِ رسالہ جیسا قلم کار اپنی تنقید کو تحقیق اور اپنی غلط فہمی کو اصلاحِ دین کا نام دے بیٹھا ہے۔

چوتھی دلیل:

صاحبِ کُرّاس نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب الِانصاف سے ایک عبارت منسوب کی ہے، جس کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ :

جو شخص امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ یا امام احمدؒ میں سے کسی ایک کے تمام اقوال کو لے کر کتاب و سنت سے بے نیازی اختیار کرے وہ در حقیقت امت کے اجماع کے خلاف اور مومنین کے راستے سے ہٹا ہوا ہے۔

میں (مصنف) کہتا ہوں کہ:

یہ عبارت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے اس سیاق میں بالکل ثابت نہیں، نہ الانصاف میں، نہ اُن کی کسی اور تصنیف میں اور خاص طور پر ایک عام مقلد، جو اجتہاد کی قدرت نہیں رکھتا اُس کے بارے میں تو دہلویؒ کا یہ کہنا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ نے اپنی متعدد کتابوں میں اس موقف کے برعکس تصریح فرمائی ہے،

چنانچہ وہ اپنی کتاب الانصاف (ص 53) اور حجۃُ اللہ البالغہ (ج 1، ص 136) میں صاف طور پر لکھتے ہیں کہ:

یہ چاروں فقہی مذاہب جو مدوّن اور منقّح صورت میں محفوظ ہیں ان کی تقلید کے جواز پر امت یا اس کے اہلِ اعتبار علماء کا اجماع قائم ہے اور آج تک ان کی اتباع جائز سمجھی گئی ہے، ان مذاہب کی بقا اور ان کی تقلید میں ایسے بے شمار مصالح ہیں جو مخفی نہیں خصوصاً ایسے دور میں جب لوگوں کی ہمّتیں پست، نفوس خواہشات میں ڈوبے ہوئے اور ہر صاحبِ رائے اپنی ہی رائے پر مغرور ہو چکا ہے۔

میں صاحبِ کُرّاس اور ان کے مقلدین کو کھلے چیلنج کے طور پر دعوت دیتا ہوں کہ وہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کسی ایک بھی کتاب سے ایسا جملہ پیش کریں جو ان کی اس من گھڑت نسبت کی تائید کرتا ہو،

پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ اسی بحث کے تسلسل میں (ص124–125)

پر یہ وضاحت کرتے ہیں کہ کسی ایک امام کے التزام و پیروی پر کوئی اعتراض نہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ :

آخر کون اس امر کا انکار کر سکتا ہے کہ سوال و جواب (استفتاء و افتاء) کا نظام عہدِ نبوی ﷺ سے لے کر آج تک مسلمانوں میں جاری ہے؟ پھر اس میں کیا فرق ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ ایک ہی عالم سے پوچھے یا بوقتِ ضرورت مختلف اہلِ علم سے رجوع کرے جب کہ ہم اس اصول پر متفق ہیں جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا؟ اور آخر کیوں نہ ہو جب کہ ہم نے کسی فقیہ کے بارے میں یہ عقیدہ نہیں رکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر فقہ وحی کی ہو یا اس کی اطاعت واجب کی ہو یا وہ معصوم ہو، اگر ہم کسی ایک امام کی اقتداء کرتے ہیں تو اس لیے کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کے علم میں گہری بصیرت رکھتے ہیں،

لہٰذا ان کے اقوال یا تو صریح نصوصِ کتاب و سنت سے ماخوذ ہوتے ہیں یا کسی نہ کسی درجہ میں ان سے مستنبط ہوتے ہیں یا پھر وہ قرائن کی بنا پر کسی حکم کی علت متعین کر لیتے ہیں اور اطمینانِ قلب کے ساتھ اسی پر قیاس کرتے ہیں، گویا وہ یہ کہتے ہیں کہ : مجھے گمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب بھی یہ علت پائی جائے تو یہی حکم مراد رکھا ہے اور قیاس بھی اسی عموم میں شامل ہے، لہٰذا اس طرح کا استنباط بھی نبی ﷺ کی تعلیم سے منسلک ہے اگرچہ درجۂ ظن میں ہو، اور اگر یہ بنیاد ہی نہ ہوتی تو کوئی مؤمن کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا،

اب ذرا غور کیجئے! دہلویؒ کا یہ جچا تلا علمی بیان خود صاحبِ کُرّاس کے دعوے کی کھلی تردید ہے، جو شخص دہلویؒ کے اصل مصادر حجۃُ اللہ البالغہ اور الِانصاف میں رجوع کرے وہ اس حقیقت کو خود بخود دیکھ لے گا کہ ان کے الفاظ اور ہماری منقول عبارت میں مکمل مطابقت پائی جاتی ہے، پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جہاں تقلید کی ممانعت کا ذکر کیا ہے وہ صرف ان افراد کے لیے ہے جو کسی ایک یا چند مسائل میں درجۂ اجتہاد کو پہنچ چکے ہوں، یعنی وہ علماء جو براہِ راست کتاب و سنت سے حکم اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں،

لیکن یہ بات بحثِ حاضر سے خارج ہے جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، لہٰذا کسی عاقل شخص کے لیے یہ گنجائش نہیں کہ وہ دہلویؒ کے ان کلمات کو لے کر عام مقلدین کے حق میں تقلید کی حرمت یا مخصوص امام کے التزام کی ممانعت پر دلیل بنائے، یہ دونوں مسئلے الگ ہیں ان کا خلطِ مبحث صرف جہالت یا تعصب سے پیدا ہوتا ہے، اور میں نہیں جانتا کہ صاحبِ کُرّاس کو ان دو واضح حقیقتوں کو گڈ مڈ کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا۔

صاحبِ رسالہ کی پانچویں دلیل

صاحبِ الکراس نے العزبن عبد السلامؒ، ابن القیمؒ اور الکمال بن الھمّامؒ کے اقوال نقل کر کے یہ دعویٰ قائم کرنے کی کوشش کی کہ (چاروں مذاہب میں سے) کسی خاص سے وابستہ رہنا ناجائز ہے اور تمام لوگوں کے لیے براہِ راست کتاب وسنت سے رجوع کرنا لازم ہے، یا پھر یہ کہ لوگ آئے دن مسلسل ایک مجتہد سے دوسرے مجتہد کی طرف پلٹتے رہیں کسی ایک مذہب پر ثابت قدم نہ رہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ بھی اس نے ان حضرات سے نقل کیا وہ اس بے بنیاد دعوے کے لیے بالکل غیر متعلق ہے جس کی کوئی شرعی یا عقلی دلیل موجود نہیں خود ان علماء کے اپنے مخصوص مذاہب تھے اور کوئی بھی ان میں سے اپنے مذھب سے ہٹ کر کسی اور مذھب کی پیروی نہیں کرتا تھا،

چناچہ: العزبن عبد السلام شافعیؒ مذھب کے پابند تھے، اور ابن القیم حنبلیؒ، اسی طرح الکمال بن الھمّامؒ حنفی المذہب تھے، یعنی صاحبِ الکراس کے دعوے کے برعکس یہ حضرات اپنے مخصوص مذہبی موقف میں مستقل اور ثابت قدم تھے ان کے اقوال دراصل انہی تین امور کے لیے ہیں جنہیں ہم نے بحث سے الگ کر کے بیان کیا، اور جن پر کوئی منصف عالم اختلاف نہیں کرتا، لہٰذا ان اقوال کو بنیاد بنا کر صاحب الکراس جو کچھ چاہتا ہے اسے درست ثابت کرنے کی کوشش کرنا سراسر غیر معقول اور علمی لحاظ سے بے بنیاد ہے یہ واضح تضاد اس بات کا اشارہ ہے کہ ان کے دلائل اصل متن اور سیاق و سباق سے گمراہ کن انداز میں

استعمال کیے گئے ہیں گویا کہ وہ اپنے مفروضات کو ثابت کرنے کے لیے الفاظ کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہوں۔

عزبن عبد السلامؒ کے کلام کی حقیقت اور خجندی کا دیا گیا مُغالطہ:

اب ذرا دیکھتے ہیں کہ امام عزالدین بن عبد السلامؒ کا وہ کلام جسے صاحبِ "کُرّاس نے اپنی من گھڑت رائے کے ثبوت میں پیش کیا ہے دراصل کس مفہوم میں ہے، امام عزبن عبد السلامؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "قواعد الأحكام في مصالح الأنام "(جلد ۲، صفحہ ۱۳۵) میں فرماتے ہیں کہ:

کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ایسے فرد کی تقلید کرے جس کی تقلید کا وہ شرعاً مکلف نہیں،

مثلاً: ایک مجتہد کا دوسرے مجتہد کی تقلید کرنا یا کسی کا صحابی کی تقلید اختیار کرنا،

کیونکہ اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس پر حاکم ہے:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾[یوسف:40]

یعنی: حکم صرف اللہ ہی کا ہے اس نے حکم دیا ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو۔

عوام اور مجتہدین میں فرق:

امام عزؒ اس بیان کے فوراً بعد وضاحت کرتے ہیں کہ یہ حکم دراصل عوام الناس کے بارے میں نہیں کیونکہ عوام اجتہاد کے دروازے سے ناواقف ہیں وہ براہِ راست قرآن و سنت سے احکام اخذ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، لہٰذا ان کے لیے کسی معتبر امام یا فقیہ کی تقلید کرنا ہی شریعت کا تقاضا ہے جبکہ یہ آیت اور

اس سے متعلق حکم مجتہدین کے حق میں ہے جو خود احکام کے استنباط کی اہلیت رکھتے ہیں، یعنی عوام پر تقلید اور مجتہد پر اجتہاد واجب ہے، ایک امام سے دوسرے امام کی طرف منتقل ہونا

پھر امام عز بن عبد السلامؒ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ :

اگر کوئی شخص ایک امام کی تقلید کرتا رہا ہو پھر کسی دوسرے امام کے مسلک کی طرف منتقل ہونا چاہے تو کیا یہ تبدیلی مذھب جائز ہے؟

وہ اس مسئلے میں اختلاف نقل کرنے کے بعد تفصیلی جواب دیتے ہیں کہ :

اگر دوسری تقلید ایسے مسئلے میں ہو جس کا نتیجہ پہلے مذہب کے حکم کی نفی کرتا ہو اور یہ تبدیلی محض خواہش یا آسانی کی بنیاد پر ہو تو ایسی تقلید درست نہیں کیونکہ شریعت میں کسی حکم کی نفی صرف اس وقت معتبر ہوتی ہے جب اس کے بطلان پر قطعی شرعی دلیل قائم ہو البتہ اگر اختلاف صرف اجتہادی فروعات میں ہو اور دونوں آراء کا حاصل ایک دوسرے سے زیادہ متصادم نہ ہو تو ایسی صورت میں دوسری رائے کی تقلید جائز ہے،

صحابہؓ اور تابعین کا طرزِ عمل

امام عز بن عبد السلامؒ اس کے بعد تقلید کے تاریخی تسلسل پر گفتگو کرتے ہیں:

وہ فرماتے ہیں کہ یہی طرزِ عمل صحابہ کرامؓ کے زمانے سے چلا آ رہا ہے لوگ اُس وقت سے لے کر ائمہ اربعہ کے ظہور تک اپنے دور کے اہلِ علم و فقہ کی آراء پر عمل کرتے رہے اور اس طرز پر کسی نے نکیر نہیں کی، لہٰذا اگر تقلید میں صرف اعلم یا افضل کی پیروی واجب ہوتی تو لازمی تھا کہ ہر شخص سب سے بڑے عالم کی طرف رجوع کرتا مگر تاریخ اس کے برعکس گواہ ہے کہ ہر علاقے اور ہر طبقے نے اپنے معتبر اور معتمد فقیہ کی رائے کو اختیار کیا حتیٰ کہ بڑے بڑے علماء نے بھی اپنی رائے دوسروں پر لازم نہیں کی۔

میں نے امام عزبن عبد السلامؒ کا یہ پورا کلام جُوں کا تُوں نقل کیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ ان کا موقف دراصل اس کے عین بر عکس ہے جو صاحبِ کُرّاس ان کے نام سے منسوب کرتا ہے، عزبن عبد السلامؒ کے نزدیک عوام کے لیے تقلید واجب ہے جبکہ صاحب کُرّاس ان پر یہ لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ صرف معصوم کی پیروی کریں اور غیر معصوم کی تقلید ترک کر دیں جیسا کہ آپ اس سے قبل ملاحظہ بھی کر چکے ہیں،

امام عزؒ کا مسلک یہ ہے کہ:

مقلّد کا اصل اور معمول طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی ایک امام کے مذہب سے وابستہ رہے پھر اگر وہ کسی دوسرے مذہب کی طرف منتقل ہونا چاہے تو اس بارے میں اہلِ علم کے مابین اختلاف ہے، خود عزبن عبد السلامؒ اس سلسلے میں جواز کے قول کو راجح قرار دیتے ہیں (وجوب کو نہیں) اور وہ بھی مخصوص شرائط کے ساتھ، یوں امام عزّبن عبد السلامؒ کے نزدیک کسی ایک مذہب سے وابستہ رہنا نہ صرف جائز ہے بلکہ علم و عمل میں ایک متوازن طرزِ عمل ہے،

مگر صاحبِ کُرّاس نے اس کے بالکل بر عکس مؤقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ:

ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ تمام ائمہ کے اقوال میں مسلسل نقل و حرکت کرتا رہے، اور کسی ایک پر ٹھہرنا اس کے لیے جائز نہیں، یہ وہ نظریہ ہے جس کی نہ عقل تائید کرتی ہے اور نہ نقل سے کوئی دلیل پیش کی جاسکتی ہے،

یہ حیرت انگیز امر ہے کہ عزبن عبد السلامؒ جیسے فقیہ کی عبارتوں سے اس شخص نے وہ مفہوم نکالے جو امام کے اصل ارادے کے سراسر مخالف ہیں، بلکہ امام نے تو انہی چیزوں کو ردّ کیا ہے جنہیں صاحبِ کُرّاس ان کے کلام

سے ثابت کرنے پر تُلا ہے [1]۔ جی ہاں عز بن عبد السلامؒ نے اسی عبارت کے بالکل بعد ایک دوسری گفتگو ذکر کی ہے۔ جس میں انہوں نے اُن فقہاء کو تنبیہ فرمائی ہے جو اپنے امام کے دلائل کی کمزوری کو جان لینے کے باوجود محض جمود و تعصب کی بنا پر اسی پر قائم رہتے ہیں اور کتاب و سنت اور صحیح قیاس کو ترک کر دیتے ہیں، انہوں نے اس طرزِ عمل کی خطرناکی پر بسیار بلیغ انداز میں روشنی ڈالی، مگر سوال یہ ہے کہ اس ساری بحث کا تعلق آخر صاحب کُرّاس کے دعوے سے کیا ہے؟ کیا وہ واقعی اس عبارت کے سیاق و سباق سے بے خبر تھا؟ یا سب کچھ جان کر دانستہ طور پر نظر انداز کیا اور امام کے کلام کو اپنے دعوے کی چادر میں لپیٹ کر ایسے مفہوم پہنا دیے جن سے امام خود بری ہیں؟

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ امام ابن القیمؒ نے اس موضوع پر کیا فرمایا:

انہوں نے اپنی کتاب (اعلام الموقعین جلد 3، صفحہ 168) میں تفصیلاً تقلید کی اقسام بیان کیں اور تقلید کو تین حصوں میں تقسیم کیا:

پہلی قسم: تقلیدِ حرام،

دوسری قسم: تقلیدِ واجب،

تیسری قسم: تقلیدِ جائز غیرِ لازم،

پھر پہلی قسم، یعنی تقلیدِ حرام کی انہوں نے تین صورتیں شمار کی ہیں:

([1])۔ دیکھیے: کُرّاس، صفحہ 13۔ یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ ہمارے اس انکشاف پر روشنی ڈالنے اور عز بن عبد السلامؒ کو جھوٹے الزامات سے بری کرنے کے بجائے کتاب پر اعتراض کرنے والی جوابی کمیٹی نے دلائل کا جواب دینے کے بجائے محض طعن و تشنیع اور گالی گلوچ ہی کو اختیار کیا۔

ان میں سے پہلی صورت یہ کہ کوئی شخص اُس وحیِ الٰہی کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی اور صرف اپنے آباؤاجداد کی تقلید پر اکتفا کرے۔

پھر علامہ ابن القیمؒ تقلیدِ حرام کی دوسری اور تیسری قسم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی شخص ایسے فرد کی تقلید کرے جس کے بارے میں اسے علم ہی نہ ہو کہ وہ فتویٰ دینے کا اہل ہے یا نہیں،

اور تیسری قسم یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کی تقلید کی جائے جس کا قول، شرعی دلیل اور واضح حجت کے بر خلاف ثابت ہو چکا ہو۔

ابن القیمؒ نے ان تینوں اقسامِ تقلیدِ باطلہ کے مفاسد، گمراہیوں اور ان کے دینی نقصانات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، انہوں نے جس شدّت سے تقلید کی مذمت کی اور جس قوت سے اس کے باطل پہلوؤں پر نکیر کی وہ سب انہی اقسام کے بارے میں تھی جو انہوں نے خود واضح طور پر متعین کر دی تھیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ بعد کے بعض سطحی قارئین یا منکرینِ تقلید نے ان کے کلام کے چند حصے اٹھا کر انہیں ان کے سیاق وسباق سے کاٹ کر، اس طرح پیش کیا گویا ابن القیمؒ نے تقلید کو مطلقاً حرام قرار دیا ہو، یہ وہی غلط فہمی ہے جس میں صاحب "الکراس" (خجندی جیسے منکرینِ تقلید) بھی مبتلا ہو گئے اور انہوں نے عدم تقلید کے ثبوت میں ابن القیمؒ کے کلام کے اقتباسات تو نقل کیئے مگر یہ نہ سمجھا کہ ابن القیمؒ کی تمام گفتگو انہی تین حرام اقسام کی توضیح کے دائرے میں محدود ہے، جو شخص ان کے کلام کو پورے تناظر میں پڑھے وہ بخوبی جان لے گا کہ ابن القیمؒ کا مقصد تقلیدِ مطلقہ کو رد کرنا نہیں بلکہ تقلیدِ مذمومہ یعنی اندھی تقلید، جاہل کی تقلید اور باطل پر تقلید کی تردید ہے،

اعتراض: اگر کوئی یہ کہے کہ : قرآنِ کریم میں تو جن لوگوں کی مذمت کی گئی ہے وہ صرف کفار اور ان کے نادان آباؤ اجداد کی تقلید کرنے والے تھے جو نہ کچھ سمجھتے تھے اور نہ ہی ہدایت پاتے تھے، لیکن علماءِ ہدایت یافتہ کی تقلید کرنے والوں کی تو کوئی مذمت نہیں کی گئی، بلکہ قرآن نے تو ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے،

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَسْـَٔلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (سورۃ الأنبیاء: 7)

یعنی : اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔ تو معلوم ہوا کہ ناسمجھ شخص کا اہلِ علم سے رجوع کرنا بھی تقلید ہی کی ایک صورت ہے اور یہ تقلید نہ صرف جائز بلکہ مطلوب بھی ہے، پھر آخر ابن القیمؒ نے تقلید کی مطلقاً مذمت کیوں کی؟

جواب: اس اشکال کا یہ ہے کہ : اللہ تعالیٰ نے جس تقلید کی مذمت فرمائی وہ دراصل یہ ہے کہ بندہ اللہ کے نازل کردہ حکم سے منہ موڑ کر اپنے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید میں لگ جائے یہی وہ تقلید ہے جس کے بارے میں سلفِ صالحین اور چاروں ائمہ کا اجماع ہے کہ یہ حرام اور مذموم ہے، البتہ جو شخص اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کے لیے پوری کوشش کرتا ہے، لیکن ان میں سے بعض امور اس پر مخفی رہ جاتے ہیں، اور وہ ان میں کسی ایسے عالم کی پیروی کر لیتا ہے جو اس سے زیادہ علم رکھتا ہے تو ایسی تقلید قابلِ تعریف ہے نہ کہ قابلِ مذمت بلکہ ایسا شخص اجر کا مستحق ہے گناہ کا نہیں۔

آگے ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ :

ان شاءاللہ تقلید کی یہ واجب اور جائز اقسام ہم آگے چل کر انہیں تفصیل سے ذکر کریں گے۔ ابن القیمؒ نے اس کے بعد باطل تقلید کی مختلف صورتوں پر تفصیلی نکیر فرمائی اور اس کے مفاسد پر تقریباً سو صفحات صرف کر دیے، تاہم بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طویل گفتگو کے بعد وہ اپنے وعدے کو بھول گئے یعنی وہ دوسری قسم تقلیدِ واجب، جس کے ذکر کا آغاز میں وعدہ کیا تھا اس کی وضاحت کی طرف واپس نہیں لوٹے بلکہ وہاں سے

اچانک وہ ایک نئے موضوع پر منتقل ہو گئے اور اب گفتگو نصوص کی حرمت، فتویٰ میں کتاب و سنت کی پابندی اور قرآن کے ساتھ سنت کے تعلق پر آ گئی، لہٰذا جس شخص نے ابن القیمؒ کی مشہور تصنیف اِعلام الموقعین کو صبر اور تدبر کے ساتھ پڑھا ہو وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس کتاب میں ایسے کئی مقامات ہیں جہاں وہ کسی بحث کو نہایت عمدگی سے بنیاد فراہم کرتے ہیں پھر اس کے جزوی پہلوؤں پر طویل شرح کرتے ہیں اور اس کی کئی استطرادی شاخیں کھول دیتے ہیں مگر بعد میں اصل موضوع کی تکمیل کیے بغیر کسی نئے باب یا مسئلے کی طرف گزر جاتے ہیں جیسا کہ یہاں بھی ہوا،(1)مزید برآں بعض مقامات پر وہ ایسے تضادات میں مبتلا ہو گئے جن کی توجیہ آسان نہیں ہوتی اور قاری ان پر متحیر رہ جاتا ہے، مثلاً وہ تضادات جو انہوں نے حیل وان کے احکام کے بیان میں ذکر کیۓ۔ بہرحال علامہ ابن القیمؒ نے تقلید کی مشروعیت اور ضرورت پر اپنی کتاب کے ایک دوسرے مقام پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے،

انہوں نے وہاں فتویٰ کے آداب اور شرائط پر طویل ابواب قائم کیئے جن میں عامی اور غیرِ مجتہد عالم کے لیے کئی اصولی ہدایات بیان کیں، چنانچہ وہ واضح کرتے ہیں کہ :

(1)۔ یہ تضادات واقعی عجیب ہیں اور ہر وہ عالم جو ابن القیمؒ کا یہ باب غور سے پڑھے انہیں بخوبی محسوس کر سکتا ہے، ان میں نمایاں مثال یہ ہے کہ ابن القیمؒ نے ایک مقام پر باطل حیلوں کی فہرست بیان کی اور ان میں ایک خلع کے ذریعے حیلہ بھی ذکر کیا، وہ لکھتے ہیں کہ : یہ حیلہ شریعتاً باطل ہے اور تمام ائمۂ امصار کے اصولوں کے خلاف ہے لہٰذا یہ خلع ایسا ہے جسے نہ اللہ نے مشروع کیا نہ ہی رسول ﷺ نے۔ (جلد 3، صفحہ 271) پھر اس کے بعد وہ ایک دوسرا مقام لاتے ہیں جہاں وہ جائز حیلوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے ذریعے مسلمان باطل حیلوں سے بچ سکتا ہے اور یہاں حیرت کی بات یہ ہے کہ انہی مثالوں میں وہ اسی خلع کے حیلے کو بھی بیان کرتے ہیں جسے انہوں نے پہلے سختی سے ردّ کیا تھا! وہ فرماتے ہیں (جلد 4، صفحہ 110 مخرج گیارہویں) خلعِ یمین ان کے نزدیک درست ہے جو اسے جائز سمجھتے ہیں جیسے اصحابِ شافعی وغیرہ، اگرچہ اہلِ مدینہ اور امام احمد وان کے تمام اصحاب کے نزدیک یہ جائز نہیں تاہم جب کسی شدید ضرورت یا تحلیل کی حاجت پیش آئے تو یہ عمل تحلیل سے بہتر اور قوی تر ہے۔ اور پھر وہ اس کی دس وجوہات ذکر کرتے ہیں، گویا اس حیلے کو شرعاً مؤثر اور پسندیدہ بنا دیتے ہیں حالانکہ تین سو صفحات پہلے اسی حیلے کی وہ شدید تردید کر چکے تھے!

جو شخص درجہِ اجتہاد تک نہیں پہنچا اس پر لازم ہے کہ وہ کسی امام کی پیروی کرے، اس کے علم سے رہنمائی لے اور حلال و حرام کے مسائل میں اسی کی تقلید کرے، اسی طرح وہ تنبیہ کرتے ہیں کہ ایسا شخص اگرچہ حدیث کی کتابوں تک رسائی رکھتا ہو اور کسی مسئلے سے متعلق کوئی حدیث تلاش کر بھی لے تب بھی اُسے خود سے فتویٰ دینے کا حق نہیں، اور اس سلسلے میں ابن القیمؒ کے کچھ نہایت اہم اقتباسات مصنف آگے پیش کرتے ہیں۔

علامہ ابن القیم نے (١٧٥/٤) میں بیسواں فائدہ بیان کیا کہ:

مقلد کے لیے جائز نہیں کہ وہ اللہ کے دین میں اس معاملے پر فتویٰ دے جس میں وہ مقلد ہے اور جس میں اسے بصیرت حاصل نہیں بلکہ صرف یہ جانتا ہے کہ یہ قول اُس عالم کا ہے جس کی تقلید کر رہا ہے، یہ اصول تمام سلف کے اجماع سے ثابت ہے اور امام احمدؒ اور امام شافعیؒ نے اسے صریح طور پر بیان کیا ہے،

ابو عمرو بن الصلاحؒ لکھتے ہیں کہ:

ابو عبد اللہ الحلیمیؒ، امام شافعیین ماوراء النہر اور قاضی ابو المحسن الرویانیؒ، صاحب بحر المذہب و دیگر علما نے قطعیت کے ساتھ فرمایا ہے کہ مقلد کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس پر فتویٰ دے جس کی وہ تقلید کرتا ہے۔ یہ حکم واضح کرتا ہے کہ صرف تقلید کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی مسئلے میں فتویٰ دینا شرعی طور پر ممنوع ہے کیونکہ فتویٰ علم و بصیرت کا متقاضی ہے نہ کہ محض قولِ عالم کی نقل کا، ابن القیمؒ نے اس اصول کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اسے صحیح موقف قرار دیا اور (١٩٦/٤) پر فرمایا ہے کہ:

اکیسواں فائدہ: اگر کوئی شخص فقہ کی تعلیم حاصل کرے اور ایک یا زیادہ فقہ کی کتابیں پڑھے اور اس کے باوجود وہ کتاب و سنت، آثارِ سلف، استنباط اور ترجیح کے علوم میں قاصر ہو تو کیا ایسے شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ فتویٰ میں تقلید کرے؟ اس سوال پر علماء کے چار قول موجود ہیں، لیکن صحیح اور مؤدبانہ موقف تفصیل بیان کرنا ہے،

اگر کوئی سوال کرنے والا کسی عالم کے نظریہ تک پہنچ سکتا ہے جو اسے رہنمائی فراہم کرے، تو ایسے شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس معاملے میں استفتاء کرے اور نہ ہی اس کے لیے جائز ہے کہ اپنے آپ کو فتویٰ کے قابل سمجھ کر عمل کرے حالانکہ وہ عالم موجود ہو اور اگر کوئی دوسرا عالم نہ ہو اور مستفتی کے پاس پوچھنے کے لیے کوئی اور نہ ہو تو بلاشبہ رجوع اسی عالم کے پاس کرنا افضل ہے، بجائے اس کے کہ بغیر علم اور بصیرت کے کسی عمل کی طرف قدم بڑھایا جائے۔

حافظ ابن القیمؒ (۲۱۵/۴: فائدہ نمبر ۳۰) میں فرماتے ہیں کہ :

اگر کوئی شخص کسی امام کے مذہب میں اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن وہ مستقل مجتہد نہ ہو، تو کیا وہ اپنے امام کے قول کے مطابق فتویٰ دے سکتا ہے؟ اس بارے میں دو آراء ہیں اور امام شافعیؒ و امام احمدؒ کے اصحاب کے دو وجوہ منقول ہیں:

پہلا قول: یہ جائز ہے مگر اس کا پیروکار، دراصل، اس زندہ مفتی کا نہیں بلکہ متوفی امام کا مقلد ہوگا، اس کے لیے صرف امام کے قول کو نقل کرنا درست ہے، اجتہاد و استنباط نہیں،

دوسرا قول: اس کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں، کیونکہ سائل، امامِ متوفی کا نہیں بلکہ اسی مفتی کا مقلد ہوتا ہے جبکہ مفتی نے اس مسئلہ میں خود اجتہاد نہیں کیا اس لیے سائل گویا کہتا ہے کہ :

میں آپ کی تقلید کرتا ہوں جو آپ کہیں گے وہی میرے لیے حجت ہے،

پھر حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ ۲۱۵/۴)

سوال: کیا زندہ شخص کے لیے کسی فوت شدہ امام کی تقلید کرنا اور اس کے فتاویٰ پر عمل کرنا جائز ہے، بغیر اس کے کہ ان فتاویٰ کو کسی یقینی دلیل سے پرکھا جائے۔

جواب: اس میں بھی امام احمدؒ کے اصحاب کے دو اقوال ہیں:

پہلا قول : جنہوں نے اس کی ممانعت کی، ان کا کہنا ہے کہ اگر امام زندہ ہوتا تو اپنے اجتہاد کو بدل سکتا تھا کیونکہ وہ ہر نئے مسئلے میں نئے سرے سے غور و اجتہاد کرتا۔

دوسرا قول : دوسرا قول جواز کا ہے اور اسی پر تمام مقلدین کا عمل جاری ہے کہ وہ اپنے اپنے ائمہ متوفین کی تقلید کرتے ہیں، کیونکہ اقوال، قائل کے مرنے سے نہیں مرتے جیسے روایات راوی کے مرنے سے ختم نہیں ہوتیں۔

حافظ ابن القیمؒ (۲۳۴/۴ فائدہ نمبر ۴۸ پر مزید فرماتے ہیں کہ :

اگر کسی شخص کے پاس صحیح بخاری و صحیح مسلم، یا ان میں سے کوئی ایک، یا رسول اللہ ﷺ کی سنتوں میں سے کوئی معتبر کتاب موجود ہو تو کیا وہ ان میں پائے جانے والی احادیث کی بنیاد پر خود سے فتویٰ دے سکتا ہے؟ فرماتے ہیں اس کا جواب تفصیل کے ساتھ ہے:

اگر حدیث کا مفہوم واضح، روشن اور سب کے لیے ایسا قابلِ فہم ہو جس میں کسی دوسرے معنی کی گنجائش نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے اس پر عمل کرنا اور اسی پر فتویٰ دینا درست ہے، اسے کسی فقیہ یا امام کے قول سے تائید لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہی اصل حجت ہے، لیکن اگر حدیث کی دلالت مخفی ہو یا مفہوم مبہم ہو تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے گمان کردہ مطلب پر عمل کرے یا فتویٰ دے، جب تک کہ اہلِ علم سے اس حدیث کی مراد اور صحیح مطلب معلوم نہ کرلے۔

پھر ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ :

یہ تمام بات اس وقت ہے جب اس شخص میں کچھ نہ کچھ علمی صلاحیت موجود ہو، اگرچہ فقہی فروع، اصولی قواعد اور عربی زبان کے ذوق میں کمی ہو، لیکن اگر وہ بالکل نااہل ہو تو اس کا فرض وہی ہے جو قرآنِ کریم نے بیان فرمایا: پس اہلِ علم سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے([1])۔ (سورۃ الأنبیاء: 7)

پھر ابن القیمؒ نے فتویٰ دینے سے متعلق (۴/۷ ۲۳) پر ایک سوال اٹھا کر اسکا جواب ذکر فرمایا ہے،

سوال: کیا کسی شخص کو اپنے امام کے مسلک سے ہٹ کر فتویٰ دینے کی اجازت ہے؟

جواب: امام ابن القیمؒ نے اس سوال کے جواب میں امام ابو عمرو ابن الصلاح رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ: جو شخص کوئی ایسی حدیث پائے جو اس کے امام کے مسلک کے خلاف ہو، اور اس شخص میں اجتہاد کی تمام شرائط اور آلات موجود ہوں، اور اپنے امام کے مسلک سے ہٹنے میں اس کے لیے شرعاً عذر و رخصت موجود ہو گی۔ واللہ اعلم۔

پھر علامہ ابن القیمؒ (۴/۷ ۲۳: فائدہ نمبر ۵۰) پر ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں کہ:

سوال: کیا ایک ایسا مفتی جو کسی معیّن امام کے مذہب سے وابستہ ہو، اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ فتویٰ دیتے وقت اپنے امام کے بجائے کسی دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دے، بایں وجہ کہ وہ قول اس کے نزدیک زیادہ قوی اور راجح معلوم ہو؟

([1])۔اب ذرا ابن القیم رحمہُ اللہ کے اس کلام کا موازنہ اُس شخص (خجندی و البانی) کے اُن اقوال سے کیجئے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اجتہاد تو بہت آسان ہے بس کتبِ حدیث یا موطا امام مالکؒ لے لو، اور اگر احادیث میں کہیں کوئی تعارض نظر آجائے تو کبھی اِس پر عمل کر لو کبھی اُس پر! کتنی سادہ فکری و خطرناک بے احتیاطی ہے!

جواب: اگر وہ مفتی اپنے امام کے طریقِ اجتہاد اور اتباعِ دلیل کے منہج پر چلنے والا ہے تو بلا شبہ اسے اجازت ہے کہ وہ اس قول پر فتویٰ دے جو دلیل کی بنیاد پر اس کے نزدیک زیادہ راجح ہے، خواہ وہ قول کسی دوسرے امام ہی کا کیوں نہ ہو۔

دوسری صورت: اور اگر وہ ایسا مجتہد ہے جو اپنے امام کے اقوال سے مقیّد ہے اور ان سے دوسروں کی طرف رجوع نہیں کرتا تو بعض اہلِ علم کے نزدیک: ایسے شخص کے لیے اپنے امام کے علاوہ کسی دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دینا جائز نہیں، البتہ اگر وہ چاہے تو بطورِ نقل یا حکایت کے دوسرے امام کا قول بیان کر سکتا ہے، لیکن اسے اپنا فتویٰ نہیں بنا سکتا۔

ترجیحِ ابن القیمؒ:

تاہم راجح اور درست موقف یہ ہے کہ: اگر کسی مقید مجتہد کے نزدیک کسی دوسرے امام کا قول دلیلِ قوی کی بنیاد پر زیادہ صحیح اور راجح ثابت ہو تو اُسے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ وہ قول اس کے امام کے اصول و قواعد کے مطابق ہو۔

علتِ ترجیح: اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام ائمہ کرام یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اصولِ احکام میں متفق ہیں، ان کے مابین اختلاف فروعی مسائل اور جزئی تفصیلات میں واقع ہوا ہے، چنانچہ جب کسی امام کا کوئی قول مرجوح قرار پاتا ہے تو درحقیقت اسی کے اپنے اصول اس قول کی تردید کرتے ہیں اور راجح قول کی تائید کرتے ہیں، لہٰذا ہر صحیح اور قوی قول دراصل ائمہ کے قواعد واصول ہی پر قائم ہوتا ہے، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ پس جب کوئی مقید مجتہد یہ دیکھے کہ ایک قول دلائل کی روشنی میں زیادہ قوی ہے اور ساتھ ہی اس کے امام کے اصول و قواعد سے ہم آہنگ بھی ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اسی قول پر فتویٰ دے۔ واللہ

الموفق۔ یہ تمام اقتباسات ابن القیم رحمہ اللہ کے اس مفصل بیان سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے فتویٰ، اس کی شرائط، آداب اور حدودِ اختیار کے متعلق تحریر فرمایا۔

اب ذرا سوچیے تو کہ: کیا یہ کلام اس شخص کا معلوم ہوتا ہے جو تقلید کو حرام قرار دیتا ہو؟ یا اس کا جو لوگوں کو براہِ راست قرآن و سنت سے احکام اخذ کرنے کا مکلف ٹھہراتا ہے؟ یا اس کا جو مقلدین کو روزانہ ایک نئے مجتہد کے پیچھے دوڑنے کا حکم دیتا ہو؟ ہر گز نہیں! یہ کلام اس فقیہِ ربانی کا ہے جو تقلید و اجتہاد کے مابین عدل و توازن کی راہ دکھاتا ہے اور امت کو افراط و تفریط کے خطرناک کناروں سے محفوظ رکھتا ہے۔

تقلیدِ عالم اور حدودِ اجتہاد

کیا تم نہیں دیکھتے کہ (ابنِ قیمؒ کے) ان تمام اقتباسات میں صاف صاف الفاظ میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ایک جاہل کے لیے سوائے تقلید کے کوئی چارۂ کار نہیں؟ مزید یہ کہ جو شخص کسی مخصوص فقہی مذہب کا پیروکار ہے اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مسئلے میں اپنے امام کے مسلک سے ہٹ کر فتویٰ دے،

الاّیہ کہ وہ اس خاص مسئلے میں خود مجتہد بن جائے۔

زندہ و فوت شدہ مجتہد کی تقلید

اسی طرح کسی فوت شدہ مجتہد کی تقلید کرنا، زندہ مجتہد کی تقلید کے بالکل برابر قرار دی گئی ہے، کیونکہ اقوال اور دلائل اپنی حیات و بقا میں قائل کی زندگی سے وابستہ نہیں ہوتے، جیسا کہ خود ابنِ قیم رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں: الأقوال لا تموت بموت قائلها" اقوال اپنے قائل کے مرنے سے نہیں مرتے۔

محض کتبِ حدیث سے اجتہاد کا وہم

پھر وہ (ابنِ قیم) یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ: محض کتبِ حدیث پڑھ لینا کسی شخص کو مجتہد نہیں بنا دیتا، کیونکہ اجتہاد کے لیے محض روایات پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ علمی بصیرت، فقہی اصول، اور استنباط کی قوت درکار ہے۔

سوال برائے منکرینِ تقلید! اب اگر کوئی (منکر تقلید) اس بات پر بضد ہو کہ ابنِ قیمؒ بھی وہی نظریہ رکھتے تھے جو صاحبِ الکراس (خجندی) رکھتے ہیں، یعنی یہ کہ ائمہ کی تقلید دراصل غیر معصوم کی تقلید ہے اور رسول اللہ ﷺ کی تقلید ہی معصوم کی تقلید ہے، لہٰذا لازم ہے کہ ہر شخص براہِ راست معصوم (یعنی قرآن و حدیث) سے مسائل کے احکام لے، تو پھر وہ ہمیں درج ذیل سوالات کے جوابات دے:

سوال نمبر ایک: آخر ابنِ قیمؒ نے چاروں مذاہب کی تقلید کو اپنی بحث کا مرکزی موضوع کیوں بنایا؟

سوال نمبر دو: ابنِ قیمؒ کیوں مقلّد کو کتبِ حدیث سے براہِ راست فتویٰ لینے سے روکتے ہیں؟

سوال نمبر تین: وہ کیوں اس پر پابندی لگاتے ہیں کہ اپنے امام کے مسلک سے باہر فتویٰ نہ دے، سوائے اس صورت کے جب وہ اس مسئلے میں مجتہد بن جائے؟

سوال نمبر چار: اور پھر کیوں ابنِ قیم فوت شدہ مجتہد کی تقلید کو بھی جائز اور روا قرار دیتے ہیں؟

ابنِ قیمؒ کے متعصب پیروکاروں کا طرزِ عمل

میں نے یہاں امام ابن القیمؒ کے اقوال تفصیل سے نقل کیے اور شاید کچھ زیادہ ہی طوالت اختیار کی لیکن اس کی وجہ محض یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ ان منکرینِ تقلید میں ایک ایسی جماعت بھی ہے جو خود کو دعاۃ اللا مذھبیہ (غیر مقلدیت کی دعوت) کہلواتی ہے اور وہ ابنِ قیمؒ کی آراء کے ساتھ اس قدر اندھا تعصب

رکھتے ہیں کہ۔ان کا یہ تعصب ان عام مسلمانوں کے تعصب سے کہیں زیادہ شدید ہے جن پر یہ خود تعصب کا الزام لگاتے ہیں! یہ عجب معاملہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اس شیخ کے اقوال پر جم جاتے ہیں، مگر ائمہ اربعہ کے اقوال پر طنز کرتے ہیں حالانکہ خود ابنِ قیمؒ ان ائمہ کے احترام کے قائل تھے، مصنفِ بوطی ایسے متعصبین سے بھی حسنِ ظن رکھتے ہوئے یہ امید لگاتے ہیں کہ:

عسى أن يسهل لهم هذا التعصب له، إذا ما تأملوا في نصوصه هذه سبيل الرجوع إلى جادة الحق.

یعنی امید ہے کہ ان کا یہی تعصب اگر وہ انصاف سے غور کریں تو انہیں ابنِ قیمؒ ہی کی نصوص کے ذریعے حق کی راہ پر واپس لے آئے۔

حافظ ابنِ قیمؒ کے کلام کا سیاق اور منکرینِ تقلید کی غلط فہمی

اب آیئے اس عبارت کی طرف، جسے صاحبِ کراس (منکر تقلید خجندی) نے ابنِ قیمؒ کے مجموعی کلام میں سے چُن کر اپنے نظریے کی تائید میں پیش کیا ہے یعنی یہ دعویٰ کہ : کسی خاص مذہب کی پابندی حرام ہے۔

مصنفِ بوطیؒ فرماتے ہیں کہ:

أما النص الذي وقع عليه اختيار صاحب الكراس فهو بعيد كل البعد عن دعواه، ليس له إليها أي منفذ أو سبيل. یعنی وہ عبارت جسے اس مصنف (خجندی نے ابنِ قیم کے طویل کلام) سے چُن لیا ہے، اس کے دعوے سے کوسوں دور ہے اور اس میں اس کے نظریے کی تائید کا کوئی دروازہ ہی نہیں کھلتا۔

علامہ ابنِ قیمؒ کی عبارت کا غلط مفہوم

صاحبِ کراس (خجندی) نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ابنِ قیمؒ کا جو جملہ پیش کیا وہ یہ ہے:

بل لا يصح للعامي مذهب، ولو تمذهب به. فالعامي لا مذهب له. فإذا قال: أنا شافعي أو حنفي أو حنبلي أو مالكي، أو غير ذلك. لم يصح كذلك بمجرد القول.

یعنی عامی کے لیے کسی مذہب کا التزام معتبر نہیں، اگر وہ کہے کہ میں شافعی ہوں یا حنفی ہوں وغیرہ تو محض زبان سے کہہ دینے سے وہ واقعی اس مذہب کا پیروکار نہیں بن جاتا۔ منکرینِ تقلید (خجندی) نے ابنِ قیم رحمہ اللہ کی اس عبارت سے یہ نتیجہ نکالا کہ تقلید بالکل ممنوع ہے، حالانکہ یہ فہم سراسر غلط ہے۔

علامہ ابنِ قیمؒ کی عبارت کا صحیح مفہوم

حالانکہ علامہ ابنِ قیمؒ کا مقصود اس قول سے یہ تھا ہی نہیں کہ تقلید ناجائز ہے، بلکہ صرف یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ:

عدم وجوب التزام المقلّد لمذهب واحد في كل فرعه ومسائله.

یعنی مقلد پر یہ لازم نہیں کہ وہ ہر مسئلے میں اپنے امام کے تمام فروعی اقوال کی پیروی کرے۔ اور یہ بات محلِ اجماع ہے، جس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، یہ تو تقلید کی نفی نہیں بلکہ تقلید پر تیسیر (آسانی) کی دلیل ہے۔ البتہ وہ ایک فقرۃ (جملہ) جو ہم نے ابنِ قیمؒ کے کلام سے نقل کیا بظاہر صاحبِ کراس (خجندی) کے نظریے کی تائید کرتا دکھائی دیتا ہے،

لیکن حقیقت میں علامہ ابنِ قیمؒ (اور دیگر علماء) کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ:

عامی شخص کا فریضہ مفتی سے فتویٰ لینا جب کوئی عامی شخص اپنے کسی دینی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے کسی مفتی (مجتھد) کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسی مفتی (مجتھد) کے فتویٰ پر عمل کرے اسے یہ

حق نہیں کہ مجتهد سے یہ تقاضا کرے ک مجھے فلاں امام یا فلاں مذہب کے مطابق فتویٰ دیا جائے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ مفتی دراصل مجتہد ہوتا ہے، اور اگر وہ مجتہد نہیں تو اسے مفتی کہنا یا فتویٰ دینے پر بٹھانا شرعاً درست ہی نہیں۔ ([1]) پھر جب وہ مجتہد ہے تو اس کی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور فہمِ شرع کے مطابق جواب دے نہ یہ کہ کسی دوسرے مجتہد کی تقلید کرے اور اس کے مذہب کی بنیاد پر فتویٰ صادر کرے۔ ہاں البتہ اگر کوئی عامی شخص محض علمی اطلاع کے طور پر یہ پوچھے کہ: امام شافعیؒ یا امام ابو حنیفہؒ نے اس مسئلے میں کیا فرمایا ہے؟

تو مفتی کے لیے جائز ہے کہ وہ بطورِ روایت دوسرے مجتهد کا قول بیان کر دے، یعنی یہ بتا دے کہ فلاں امام کی رائے اس مسئلہ میں یہ ہے، مگر اس کی حیثیت محض روایت کی ہو گی فتویٰ کی نہیں، اسی طرح عامی کے لیے یہ بھی درست نہیں کہ وہ کسی مجتہد سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ اس کے مخصوص امام کے مذہب پر فتویٰ دے، کیونکہ وہ خود علمی طور پر اس قابل نہیں کہ کسی مذہب کے دقائق کو سمجھے، ایسا عامی دراصل جاہل ہے جو علم کا

([1])۔ یہ بات واضح رہے کہ مصنف کا مقصد اس جملے میں ان معاصر مفتیانِ کرام کی نفی نہیں ہے جو درسِ نظامی کے بعد افتاء کا باقاعدہ تخصص (یعنی مفتی کورس) کرتے ہیں بلکہ وہ دراصل اصطلاحی مجتہد کی بات کر رہے ہیں، جس کا درجہ بہت بلند ہوتا ہے، شرعاً اجتہاد کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص براہِ راست قرآن و سنت سے احکام کے استنباط کی کامل صلاحیت رکھتا ہو یعنی وہ اصولِ فقہ، ناسخ و منسوخ، لغتِ عرب، اور دلائلِ شرعیہ کی باریکیوں میں اس درجے کا ماہر ہو کہ کسی امام کی تقلید کے بغیر خود سے شرعی حکم متعین کر سکے تو ایسے شخص کو مجتہدِ مطلق کہا جاتا ہے اور اسی کے لیے مسندِ فتویٰ بالذات جائز ہے، جبکہ آج کل کے مفتیانِ کرام جو کسی امام کے فقہی اصول پر قائم رہتے ہوئے تخصصِ فی الفتویٰ کی سند رکھتے ہیں وہ مجتہد فی المذہب یا مفتی منتسب کے درجے میں آتے ہیں، ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے امام کے اصول و قواعد کی روشنی میں زمان و حالات کے مطابق فتاویٰ صادر کریں، جیسا کہ اکابرِ امت نے ہمیشہ کیا، لہٰذا مصنف کے اس جملے سے یہ مراد لینا کہ عصرِ حاضر کے مفتیانِ کرام یا دار الافتاء کے اہلِ فتویٰ شرعاً مسندِ افتاء پر بیٹھنے کے اہل نہیں صریح غلط فہمی ہو گی، ان کی علمی تربیت، فقہی بصیرت، اور شرعی اہلیت اُمت کے لیے نعمت ہے اور ان کے فتاویٰ کا اعتبار جمہورِ امت کے نزدیک مسلم و متفقہ ہے۔ (مترجم)

دعویٰ کرتا ہے، حالانکہ اگر وہ واقعی اس امام کے مذہب سے واقف ہوتا تو اسے کسی مجتہد کے سامنے سوال کرنے کی حاجت ہی نہ رہتی.

اصولِ فقہ کا قاعدہ

علماء نے اس موقع پر ایک اصولی قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ:

مذہبُ العاميّ مذهبُ مفتيه- یعنی عامی کا مذہب وہی ہے جو اس کے مفتی کا مذہب ہو. اسی بنیاد پر عامی کا کوئی مستقل فقہی مذہب نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مذہب درحقیقت اس کے مفتی کا ہی مذہب ہوتا ہے۔

مجتہد کے بعد مقلدین کے لیے راہِ عمل

لہٰذا جب کوئی عامی شخص اپنے اِرد گرد نظر ڈالے اور اسے نہ کوئی مجتہد مطلق دکھائی دے نہ ایسے علماء جو خود اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں بلکہ ہر طرف مقلد علماء ہوں جو کسی نہ کسی امام کے مذہب پر قائم ہیں، تو ایسی صورت میں جو لوگ آج کل مفتی کہلاتے ہیں، وہ دراصل مجازاً مفتی کہلاتے ہیں حقیقتاً نہیں، [1]) ایسی حالت میں قاعدہ **مذہب العامي مذهب مفتيه** اس شخص پر براہِ راست منطبق نہیں ہوتا، کیونکہ اب وہ مفتی (یعنی مجتہد) ہی موجود نہیں جس سے عامی کو فتویٰ مل سکے. اب چونکہ عامی کو اپنے زمانے میں کوئی مجتہد نہیں ملتا، اس لیے اس پر لازم ہے کہ وہ سابقہ مجتہدین میں سے کسی ایک کی طرف رجوع کرے، اور آپ گزشتہ صفحات میں یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ علماء نے، بالخصوص ابن القیمؒ نے فرمایا کہ:

([1]) یہ بات تو وہ نیا طالب علم بھی جانتا ہے جس نے کبھی مفتی، عالم اور مجتہد کے مفاہیم میں فرق سمجھا ہو۔

الأقوال لا تموت بموت قائليها" یعنی اقوال اپنے قائلوں کی موت سے نہیں مرتے. اس لیے زندہ شخص کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ کسی فوت شدہ مجتہد کی تقلید کرے کیونکہ حق و علم موت سے ختم نہیں ہوتا.

ائمہ اربعہ کی تقلید پر اجماع

ان (فوت شدہ) مجتہدین میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ائمۂ اربعہ (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ) ہیں اور ان کی تقلید پر امتِ مسلمہ کا اجماع ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ائمہ کے مذاہب کو سب سے زیادہ علمی خدمت، تحقیق، نقد و تنقید اور فقہی تدوین حاصل ہوئی، ان کے اقوال صحیح اسناد کے ساتھ ان تک پہنچے اور ان کے اصول و قواعد محفوظ و مستند ہیں.

عامی شخص کے لیے اختیار:

لہٰذا عامی شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ ان میں سے جس امام کے مذہب کو چاہے اختیار کرے چاہے اپنے وقت کے علماء و فقہاء سے دریافت کر کے، یا اگر علمی استعداد ہو تو ان کی کتب سے استفادہ کر کے، پھر اسے یہ بھی اختیار ہے کہ وہ ان ائمہ میں کسی بھی ایک امام کے مذہب پر استقامت اختیار کر سکتا ہے، یا کسی دوسری فقہی مصلحت کے تحت دوسرے امام کے مذہب کی طرف منتقل بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان شرائط کو ملحوظ رکھے جن کا ذکر علماء نے کیا ہے اور جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، عامی شخص جب ایسا کرتا ہے تو دراصل وہ قاعدہ مذہب العامي مذهب مفتيه ہی پر عمل پیرا ہوتا ہے، کیونکہ جب اس نے اپنے زمانے میں کوئی مجتہد نہ پایا اور سابقہ مجتہد مثلاً امام شافعیؒ کی طرف رجوع کیا، تو وہ گویا ان کا مقلد بن گیا اور یہی اس قاعدے کا منطقی اور اصولی مفہوم ہے. یہی مفہوم امام ابن القیمؒ کے کلام کا خلاصہ ہے، جو آپ کو تمام اصولی

کتب میں باب الاجتہاد کے تحت واضح طور پر مل جائے گا جس کتاب کی طرف چاہو آپ رجوع کرو آپ کو وہاں یہی تفصیل ملے گی۔

علامہ کمال ابن الہمامؒ کا منہجِ تقلید

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ علامہ کمال ابن الہمامؒ جو اصولِ فقہ اور استنباط میں جلالتِ علمی رکھتے ہیں اس مسئلے میں کیا فرماتے ہیں:

وہ اپنی مشہور تصنیف التحریر میں رقم فرماتے ہیں کہ:

سوال: کیا کوئی شخص کسی مسئلے میں ایک مجتہد کی تقلید کرے اور کسی دوسرے مسئلے میں کسی دوسرے مجتہد کی تقلید کرے تو یہ جائز ہے؟

جواب: ابن الہمامؒ اس سوال کا راجح اور مختار جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

جی ہاں یہ بالکل جائز ہے، کیونکہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ پہلے ادوار میں لوگ کبھی ایک عالم سے فتویٰ لیتے، کبھی دوسرے سے اور کسی ایک مفتی کے ساتھ ہمیشہ کی وابستگی لازم نہیں سمجھتے تھے، البتہ اگر کوئی شخص کسی خاص امام، مثلاً امام ابو حنیفہؒ یا امام شافعیؒ، کے مذہب سے وابستہ ہو جائے، تو اس بارے میں دو آراء پائی جاتی ہیں:

پہلی رائے: ایسے شخص پر لازم ہے کہ ہمیشہ اسی مذہب پر قائم رہے۔

دوسری رائے: اور دوسری رائے یہ ہے کہ ایسا اس شخص پر لازم نہیں.

پھر شارح التحریر (علامہ ابن امیر الحاجؒ) نے دوسری رائے کو ترجیح دی ہے اور یہی جمہور علماء کا موقف ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ شرعاً واجب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہو اور اللہ تعالیٰ نے عوام پر صرف یہ لازم کیا ہے کہ وہ کسی عالم مجتہد سے فتویٰ حاصل کریں نہ یہ کہ وہ ہمیشہ ایک ہی امام کے اقوال کے پابند بنے رہیں،

منکرِ تقلید خجندی کی علمی یتیمی

صاحبِ الکراس (خجندی) نے اس مقام پر ایک سنگین علمی غلطی کا ارتکاب کیا، وہ یہ ہے کہ اُس نے کمال بن الہمامؒ کی طرف ایک طویل عبارت منسوب کر دی جو در حقیقت ان کی نہیں بلکہ ابن امیر الحاج کی ہے جو انہوں نے شرح التحریر میں ذکر کی اور اس شرح کا نام التقریر والتحبیر ہے، مگر صاحبِ الکراس خجندی نے اس عبارت کو براہِ راست ابن الہمام کی طرف منسوب کر دیا اور مزید یہ کہ ان کے نام سے ایک کتاب "التقریر والتحبیر" بھی گھڑ لی، حالانکہ کمال بن الہمامؒ نے ایسی کوئی تصنیف لکھی ہی نہیں [1]

ابن امیر الحاج اور ابن القیم کی ہم آہنگی

مزید یہ کہ ابن امیر الحاج نے اپنی مذکورہ شرح میں وہی مفہوم بیان کیا جسے ابن القیمؒ نے بھی واضح کیا ہے: کہ عامی کا کوئی مخصوص مذہب نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مذہب وہی ہوتا ہے جس مفتی سے وہ فتویٰ حاصل کرے، یہی بات فقہاء کے نزدیک مسلم ہے کہ عامی اجتہاد نہیں کر سکتا بلکہ سوال واستفتاء ہی اس کا دینی فریضہ ہے اور اس کے لیے کسی ایک امام کے ساتھ تاحیات وابستگی لازم نہیں۔

(1)۔ دیکھو التقریر والتحبیر لابن أمیر الحاج (350/3)

خجندی کی چھٹی دلیل:

خجندی کا ائمہ اربعہ کے مذاہب کو سیاستِ جبر واستبداد کا نتیجہ قرار دینا، صاحبِ کُرّاس (خجندی) نے اپنی جہالت آمیز جسارت میں یہ عجیب وغریب دعویٰ کیا ہے کہ: ائمہ اربعہ کے فقہی مذاہب دراصل سیاسی جبر واستبداد اور غیر عرب حکمرانوں کی ذاتی اغراض کا پیدا کردہ مظہر ہیں، خجندی کے بقول! ان حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے اور عوام پر اپنی گرفت قائم رکھنے کے لیے ان فقہی مکاتبِ فکر کو رائج کیا اور اسی سبب سے یہ مذاہب بعد میں امت میں پھیل گئے، خجندی کا اپنے اس دعویٰ کی نسبت ابن خلدونؒ کی طرف کرنا مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ صاحبِ کُرّاس نے اپنے اس بے اصل اور لغو گمان کو علامہ ابن خلدونؒ جیسے محقق و فلسفیِ تاریخ کی طرف منسوب کرنے کی جسارت کی!

انہوں نے بڑے اعتماد سے لکھا کہ:

اگر تم یہ جاننا چاہو کہ فقہی مذاہب اور فقہی طریقوں کے پیدا ہونے کی اصل وجوہ کیا ہیں تو ابن خلدونؒ کی مقدمہ تاریخ کا مطالعہ کرو، کیونکہ انہوں نے اس موضوع پر نہایت عمدہ گفتگو کی ہے، وہاں تمہیں معلوم ہوگا کہ مذاہب کے ظہور اور ان کے عام ہونے کا سبب دراصل ظالمانہ سیاستیں اور غیر عرب حکمرانوں کی اغراضِ نفسانیہ تھیں۔[1]

دعویٰ خجندی کا رد وعلمی محاسبہ

علامہ بوطیؒ اس دعوے کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

([1])۔ کُرّاس، صفحہ 45

ہم نے خود وہی کیا جس کی طرف صاحبِ کُرّاس نے رہنمائی کی تھی ہم نے ابن خلدونؒ کے مقدمہ کو بار بار کھولا، اس کے ابواب کو بغور پڑھا اور یہ تلاش کرنے کی سعی کی کہ آیا کہیں وہ ان مذاہب کی پیدائش کو سیاسی یا عجمی اثرات سے منسوب کرتے ہیں یا نہیں؟

لیکن تلاشِ بسیار کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ:

ہمیں ابن خلدونؒ کے پورے بیان میں اس خیال کا شائبہ تک نہیں ملا، بلکہ ان کے تمام اقوال میں حق، تحقیق اور جمہورِ امت کا اجماعی مؤقف جھلکتا ہے یعنی یہ کہ فقہی مذاہب کا ظہور دراصل قرآن وسنت کی فہم و تطبیق کے خالص علمی واجتہادی مراحل سے ہوا، نہ کہ کسی سیاسی سازش یا خارجی دباؤ سے۔ اب آیئے دیکھتے ہیں ابنِ خلدونؒ نے اس بارے میں کیا کچھ لکھا ہے:

ابنِ خلدونؒ نے مقدمہ ابن خلدون (ص216، طبع بولاق) میں علمِ فقہ کی پیدائش، ارتقاء اور فقہی مذاہب کے ظہور پر گفتگو کرتے ہوئے نہایت عالمانہ اسلوب میں یوں فرمایا ہے کہ:

تمام صحابۂ کرامؓ فتویٰ دینے والے نہ تھے نہ ہی دین کے احکام ہر ایک سے حاصل کیے جاتے تھے بلکہ یہ شرف اُن مخصوص حضرات کو حاصل تھا جو قرآنِ کریم کے حامل اس کے ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ اور دلالاتِ الفاظ و معانی سے بخوبی واقف تھے، یہ علم انہوں نے براہِ راست نبی کریم ﷺ سے یا اُن کے منتخب اصحاب سے سیکھا تھا، انہی کے علمی مقام و امتیاز کی بنا پر انہیں قراء کہا جاتا تھا، یہ طرزِ عمل صدرِ اوّل کے دور میں متواتر جاری رہا یہاں تک کہ اسلام کی سلطنت وسیع تر ہوئی مختلف ممالک و شہروں میں علم کا چرچا ہوا، عربوں میں اَن پڑھ پن (اُمیّت) ختم ہوئی، قرآن و سنت کے مطالعہ اور فقہی استنباط کی صلاحیتیں نشو و نما پانے لگیں، نتیجتاً علمِ فقہ ایک منضبط صنعت اور مستقل علمی فن کی حیثیت اختیار کر گیا، اب وہ حضرات جو استنباط و استدلال میں مہارت رکھتے تھے فقہاء اور علماء کے لقب سے معروف ہوئے، یہیں سے فقہ کے دو مناہج وجود میں آئے:

ایک اہل الرائے والقیاس کا منہج جن کا علمی مرکز عراق تھا، اور دوسرا اہل الحدیث کا منہج جو حجاز کے علماء کی خصوصیت تھی، چونکہ اہلِ عراق کے پاس روایاتِ حدیث کم تھیں (جیسا کہ ابنِ خلدون پہلے واضح کر چکے ہیں) اس لیے انہوں نے قیاس واستنباط پر زیادہ توجہ دی اس فن میں مہارت حاصل کی اور اپنی فقہی بنیادیں عقلِ سلیم اور اجتہادی قیاس پر استوار کیں، اسی بناپر انہیں اہل الرائے کہا گیا اس مکتبِ فکر کے امامِ اعظم امام ابو حنیفہؒ ہیں، جنہوں نے اس فقہی منہج کو علمی وقار واصولی ترتیب بخشی اور ان کے تلامذہ نے اسے ایک مربوط فقہی نظام کی شکل دے دی۔

اس کے بعد امام مالک بن انسؒ اور ان کے بعد امام شافعیؒ کے ذریعے یہ نمایاں ہوا۔ بعد ازاں بعض علماء نے قیاس کے جواز ہی سے انکار کر دیا اور اسے باطل العمل قرار دیا، یہ طبقہ ظاہر یہ کہلایا ان کے نزدیک شرعی دلائل صرف نصوص (قرآن وحدیث) اور اجماع تک محدود ہیں، اس لیے وہ حتیٰ کہ قیاسِ جلی اور منصوص العلۃ کو بھی نص ہی کی طرف لوٹاتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ جب کسی علت پر نص وارد ہو جائے تو وہ علت اپنے تمام مظان میں حکمِ شرعی کے لیے بمنزلۂ نص ہوتی ہے،

اس مکتب کے امام داود بن علی ظاہریؒ تھے، جن کے بعد ان کے فرزند اور تلامذہ نے اس منہج کو آگے بڑھایا، یوں ان ادوار میں یہی فقہی مذاہب حنفی، مالکی، شافعی اور ظاہری امتِ مسلمہ کے مابین معروف و متداول ہو گئے اور انہی کے ذریعے علمِ فقہ کو وہ ضبط واستحکام حاصل ہوا جس نے شریعت کی عملی تطبیق کو قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک ایک منظم علمی قالب میں محفوظ رکھا۔

اس کے بعد ابنِ خلدونؒ نے یہ واضح کیا کہ بعض شیعہ گروہوں نے ایسے فقہی مسالک گھڑ لیے جو محض ان کے اپنے بنائے ہوئے تھے ایسے اصول وفروع جو امت کے اجماعی مناہج سے بالکل مختلف تھے، یہی روش خوارج نے بھی اختیار کی انہوں نے بھی اپنے لیے ایک جدا فقہی نظام قائم کیا اور یوں دونوں فرقے امت کے جمہور اہلِ علم کی راہ سے ہٹ کر چل پڑے اور اُن مذاہب سے الگ ہو گئے جن پر مسلمانوں کی اکثریت کا

اتفاق اور اعتماد قائم تھا، پھر ابنِ خلدونؒ نے فرمایا کہ مذہبِ ظاہر یہ جو کبھی ایک معروف فقہی مکتب تھا رفتہ رفتہ مٹ گیا اس کے زوال کے اسباب میں سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس کے ائمہ و محدثین کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور جب علمِ اصولِ فقہ کی تدوین اور قواعدِ استنباط کی ترتیب و تقنین مکمل ہوئی تو اہلِ علم کی اکثریت نے اس مذہب کے متبعین پر نکیر کی انکار اور تنقید کے اس ماحول میں ظاہر یہ کی جڑیں کمزور پڑ گئیں

ابنِ خلدونؒ فرماتے ہیں کہ :

یہ مذہب اب محض چند ضخیم کتابوں تک محدود رہ گیا ہے بعض طلبہ محض شوق یا ضد میں اپنے آپ کو اس مسلک سے منسوب کر لیتے ہیں اور انہی کتابوں میں اس کی فقہ تلاش کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ علم کی صحیح راہ یعنی ائمہ و معلمین کے ذریعہ حاصل کرنے سے ناواقف ہوتے ہیں اس لیے ان کی یہ کاوش بے نتیجہ رہتی ہے نتیجتاً وہ جمہورِ امت کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں اور بعض اوقات ان کا یہ طرزِ عمل اہلِ بدعت کے مسلک سے مشابہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ جو شخص علم کو محض کتابوں سے بغیر کسی استاد کے رہنمائی کے حاصل کرتا ہے وہ علم کی کنجیوں سے محروم رہتا ہے۔

ائمہ اربعہ کا علمی مقام اور فقہی منہج کا امتزاج

پھر ابنِ خلدونؒ نے ائمہ اربعہ کا تعارف تفصیل سے پیش کیا ہر امام کے علم، فضل، فقہی بصیرت اور منہجِ استنباط کو واضح کیا انہوں نے بیان کیا کہ کس طرح ہر امام نے اپنے اجتہاد کو اصولِ شریعت کی روشنی میں منضبط کیا اور کیسے امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ نے اہلِ حجاز اور اہلِ عراق دونوں کے فقہی مناہج کو ایک دوسرے میں پیوست کر دیا اس حکیمانہ امتزاج سے فقہ کی دونوں علمی روایتیں اثر و روایت کی گہرائی اور عقل و استنباط کی بصیرت ایک دوسرے کی تکمیل بن گئیں،

ابنِ خلدونؒ نے مزید وضاحت کی کہ ہر امام کے مذہب نے مختلف علاقوں میں اپنے اثرات قائم کیے کہیں فقہِ حنفی نے سلطنتوں کو سنوارا، کہیں فقہِ مالکی نے عدل و قضاء کے اصولوں کو منظم کیا، کہیں فقہِ شافعی نے اصول واستدلال کو ایک فن کی صورت دی اور کہیں فقہِ حنبلی نے روایت و نص پر استقامت کی مثال قائم کی۔

اجتہاد کا دروازہ بند ہونا اور اس کے اسباب

پھر ابنِ خلدونؒ نے زمانۂ متاخرین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

جب علوم میں اصطلاحات کی کثرت اور مسائل کی تفصیلات بے انتہا بڑھ گئیں تو اجتہاد کا درجہ حاصل کرنا دشوار سے دشوار تر ہو گیا پھر یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ عظیم منصب اُن لوگوں کے سپرد نہ ہو جائے جو نہ علم کے اہل ہیں نہ رائے کے معتبر اور نہ دیانت و تقویٰ کے پابند، اسی خوف اور علمی پیچیدگی کے سبب لوگوں نے اختلاف واجتہاد کے دروازے بند کر دیے۔

خلاصہِ خلدون و مُغالطہِ خجندی

یہ وہ جامع اور مانع گفتگو ہے جو علامہ ابنِ خلدونؒ نے مذاہبِ اربعہ اور ان کے ظہور کے تاریخی و علمی پس منظر میں بیان فرمائی ہے، ان کے تجزیے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ان مذاہب کا قیام کسی سیاسی جبر، حکومت کی مداخلت یا عجمی غلبے کا نتیجہ نہیں، بلکہ امت کے اندر فکری واجتہادی ارتقاء کا ایک قدرتی اور علمی تسلسل ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابنِ خلدونؒ کی یہ تحقیق صاحبِ کُرّاس (خجندی) کے لیے کسی طرح بھی باعثِ اطمینان نہیں ہو سکتی، وہ اپنے دعوے کے لیے اس میں نہ کوئی سہارا پا سکتے ہیں نہ کوئی دلیل، کیونکہ پورے مقدمہ ابنِ خلدون میں ایسا ایک لفظ بھی نہیں جو ان کے اس مفروضے کی تائید کرتا ہو کہ:

مذاہبِ اربعہ کا قیام دراصل ظالمانہ سیاستوں اور غاصب حکمرانوں کے اثر سے ہوا تھا۔

قاری کے نام علمی دعوت

میں اپنے محترم قارئین سے مؤدبانہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ خود مقدمہ ابنِ خلدون کے متعلقہ حصے کا مطالعہ کریں، پوری بحث کو مکمل طور پر پڑھ کر خود انصاف سے فیصلہ فرمائیں کہ کیا وہاں واقعی کوئی ایسی عبارت موجود ہے جو اس الزام کی تائید کرے؟ اور اگر قاری کو ایسی کوئی بات نہ ملے اور یقیناً نہیں ملے گی تو پھر وہ خود اس طرزِ استدلال، اس تحریفِ معنی، اور اس عقلی فریب کو جس نام سے چاہیں موسوم کریں خواہ اسے افتراء علمی کہا جائے، یا تلبیسِ باطل بر چہرۂ علم یہ فیصلہ اب قاری کی بصیرت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

مصنف کا ایفائے عہد

رہا میں، تو میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں ان تعبیرات کو اختیار نہیں کروں گا، کیونکہ میں نے اپنی اس کتاب کے آغاز ہی میں عہد کیا تھا کہ میں اپنی گفتگو کو خالص علمی اور تحقیقی اسلوب میں پیش کروں گا، اور اپنے قلم کو کسی ایسے لفظ یا طرزِ بیان پر آمادہ نہیں کروں گا جو علمی وقار اور تہذیبی شائستگی سے نیچے ہو، اگرچہ صاحبِ کُرّاس کی پوری تحریر ایسے ہی سخت، جارحانہ اور غیر شائستہ جملوں سے بھری ہوئی ہے۔

صاحبِ کراس خجندی کی ساتویں دلیل

ائمہ اربعہ سے پہلے امت کی ہدایت اور ایک سطحی مغالطہ آمیز استدلال صاحبِ کُرّاس اپنی ساتویں دلیل میں یوں لکھتے ہیں کہ :

مقلد سے کہا جائے کہ بتاؤ! لوگوں کا حال اُس وقت کیا تھا جب یہ ائمہ اربعہ مثلاً فقہ حنفی و شافعی وغیرہ کا وجود نہیں تھا، جن کی تم آج تقلید کرتے ہو اور جن کے اقوال کو تم نے شارع (اللہ اور رسول ﷺ) کے نصوص کے برابر قرار دے دیا ہے؟ کیا وہ لوگ ان ائمہ کے پیدا ہونے سے پہلے ہدایت پر تھے یا گمراہی میں؟ یقیناً تمہیں ماننا پڑے گا کہ وہ ہدایت پر تھے، تو پھر ان سے پوچھا جائے کہ وہ کس چیز پر تھے سوائے اس کے کہ وہ قرآن، سنت، آثارِ صحابہؓ کی پیروی کرتے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے قول کو مقدم رکھتے، اور انہی کی طرف رجوع کرتے بغیر کسی امام کے قول کو معیار بنائے؟ اور جب یہی طرزِ عمل ہدایت تھا تو پھر حق کے بعد اور کیا رہ جاتا ہے سوائے گمراہی کے؟ تو آخر تمہیں کدھر الٹا یا جا رہا ہے؟ (کُرّاس، ص38)

دلیلِ ہفتم کا جواب: عہدِ صحابہ سے جاری تقلید، اُمت کا ایک زندہ نظام ہے ہم اس عجیب و غریب دلیل کے پس پردہ حقیقت کو منکشف کرتے ہوئے اُس مُقلد کی طرف سے جواب دیتے ہیں جس سے صاحبِ رسالہ (خجندی) نے یہ سوال کیا ہے۔ تو سنئے ہم جواباً کہتے ہیں کہ:

جب آپ نے خود ہی ابن خلدونؒ کے کلام پر اعتماد کیا ہے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس (ابن خلدونؒ) کے (کلام کے) تمام پہلوؤں کو تسلیم کرو،

کیا ابن خلدونؒ نے اسی باب میں یہ نہیں فرمایا کہ:

تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ اجمعین اہلِ فتویٰ نہیں تھے، نہ ہی دین کا علم ہر ایک سے لیا جاتا تھا، بلکہ یہ مرتبہ اُن خاص اصحاب کو حاصل تھا جو قرآن کے حامل، اُس کے ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ اور دلالاتِ معانی سے واقف تھے۔ اب بتاؤ، اس واضح اور روشن کلام کا مفہوم کیا ہے؟

اگر اہلِ فتویٰ و اجتہاد صحابہ میں ایک محدود اور ممتاز گروہ تھا اور باقی حضرات اس درجے پر فائز نہ تھے، تو پھر وہ باقی صحابہ اپنا دین کہاں سے لیتے تھے؟ کیا وہ براہِ راست وحی کے دروازے سے علم لیتے تھے؟

نہیں! بلکہ وہ انہی اہلِ علم واجتہاد صحابہ سے دین حاصل کرتے تھے، انہی کے فتاویٰ کو اپنے عمل کا معیار بناتے اور انہی کی تعبیرات کو دلیلِ راہ سمجھتے تھے۔ تو پھر ذرا انصاف سے بتاؤ کیا یہی تقلید نہیں؟ کیا تقلید اس کے سوا کسی اور حقیقت کا نام ہے؟ لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ زمانہ بدلنے سے سنت نہیں بدلی ہاں صرف ناموں کا تغیّر ہوا، حقیقت وہی باقی رہی

عہدِ رسالت میں عوام اپنے سوالات کے لیے اہلِ علم صحابہ سے رجوع کرتے، عہدِ تابعین میں لوگ ان کے شاگردوں سے مسائل پوچھتے اور جب امت نے علمی تدوین کے دور میں قدم رکھا تو یہی عمل منظم شکل میں ائمۂ اربعہ کی صورت میں جلوہ گر ہوا، لہٰذا جس طرح عوام کے لیے عہدِ صحابہ میں ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ، اور خلفائے راشدینؓ کی تقلید روا تھی، [1] اسی طرح بعد کے زمانوں میں امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمدؒ جیسے مجتہدین کی تقلید بالکل اسی تسلسل کا مظہر ہے۔

کیا تاریخ اور فقہِ اسلامی کے تمام مؤرخین و محققین اس حقیقت پر متفق نہیں کہ عہدِ تابعین میں دو بڑے فقہی رجحانات موجود تھے،

([1])۔ منکرینِ تقلید کو سمجھنا چاہئے کہ تقلید کوئی حادثاتی یا وقتی رجحان نہیں، نہ ہی یہ کسی سیاسی جبر یا عصبی گروہ بندی کی پیداوار ہے، بلکہ یہ امتِ مسلمہ کا فطری اور ازلی نظامِ دینی رہنمائی ہے جو قرنِ اول سے لے کر آج تک علم و عمل کی متصل سند کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ یہی وہ منظم علمی ڈھانچہ ہے جس کے ذریعے امت نے قرآن و سنت کے فہم، اصولِ اجتہاد اور فقہی استنباط کو محفوظ، منضبط اور قابلِ اعتماد انداز میں منتقل کیا، اگر ہر دور کا عام مسلمان براہِ راست نصوص سے احکام اخذ کرنے بیٹھتا تو اُمت انتشار و تضاد میں بکھر جاتی، مگر تقلید نے اس کے علم و عمل کو اہلِ علم کی رہنمائی سے مربوط رکھا اور شریعت کے فہم کو ایک مستقل، متوازن اور معتبر علمی نظام کی صورت میں محفوظ کیا، لہٰذا جس تقلید کو آج بعض لوگ موردِ طعن ٹھہراتے ہیں، درحقیقت وہی دین کی بقا، امت کی فکری وحدت، اور علمِ شریعت کے تسلسل کی اصل بنیاد ہے۔ (مترجم)

ایک اہلِ حدیث کا مسلک [1] جو حجاز میں رائج تھا،

اور دوسرا اہلِ رائے کا مسلک جو عراق میں پروان چڑھا۔

اور یہ کہ عام اہلِ حجاز اسی مسلک کی پیروی کرتے تھے جو وہاں غالب و معروف تھا، جبکہ اہلِ عراق بھی اپنے خطے میں رائج فقہی طریقِ کار کی تقلید کرتے تھے؟ یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں مسالک کے اپنے اپنے ائمہ و رہنما تھے، جو اپنے اپنے دائرے میں اجتہاد، تفقہ اور فتویٰ کے مراتب پر فائز تھے، پھر جب چاروں فقہی مذاہب وجود میں آئے تو آخر کون سا ایسا انقلاب برپا ہوا جو اس سابقہ حقیقت کے منافی ہو؟ کوئی نیا نظام تو سامنے نہیں آیا، بس اتنا ہوا کہ ان ائمہ اربعہ نے اجتہاد و استنباط کے لیے ایک منہج و اصولی ضابطہ مرتب فرمادیا جو کتاب و سنت کے دلائل سے ماخوذ تھا، ان ائمہ نے اس منہج کے ذریعے رائے و قیاس کے صحیح اصول کو منضبط کیا اور صحیح و باطل قیاس کے درمیان واضح امتیاز قائم کیا، یوں اہلِ رائے اور اہلِ حدیث کے دونوں رجحانات نہ صرف ایک دوسرے سے قریب ہوئے، بلکہ آہستہ آہستہ افراط و تفریط کے دونوں کنارے معدوم ہوتے گئے، یہی وہ بنیادی عمل تھا جس نے چاروں فقہی مذاہب کو علمی و اجتہادی سطح پر ایک نمایاں مقام عطا کیا، اور مختلف طبقاتِ امت نے ان کی اتباع والتزام کو علمی اعتماد اور روحانی سکون کے ساتھ قبول کیا، یہ ایک ایسا

([1]) ۔ یہاں اہلِ حدیث سے مراد وہ جلیل القدر محدثین وفقہاء ہیں جو فقہی استنباط میں اصولِ شریعت کے پابند اور نصوصِ کتاب و سنت کے ماہر تھے، مثلاً امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام بخاریؒ، امام ابن خزیمہؒ، امام بیہقیؒ وغیرہم۔ یہ طبقہ علم و عمل کے تسلسل کا امین تھا اور اجتہاد کو منضبط اصولوں کے دائرے میں انجام دیتا تھا، لہٰذا یہ اصطلاح ہر گز موجودہ دور کے غیر مقلدین یا منکرینِ تقلید پر منطبق نہیں ہوتی، کیونکہ وہ فقہی تسلسل اور اصولی نظام سے منقطع ایک جدید فکری رجحان ہیں، جن کا ظہور بعد کے ادوار میں مخصوص حالات کے تحت ہوا، اس مقام پر اہلِ حدیث کا اطلاق صرف اُن محدثینِ امت پر ہے جنہوں نے تقلیدِ اصولی، اجتہادِ منضبط اور نصوصِ شرع کی حفاظت کی اور تینوں کو جمع کر کے امت کو علمی اعتدال اور دینی استقامت کا نمونہ عطا کیا۔ (مترجم)

تاریخی و علمی واقعہ ہے جو نہ صرف معروف ہے بلکہ تفصیل سے مدوّن بھی ہے، لہٰذا اس پر شواہد پیش کرنے میں وقت صرف کرنا غیر ضروری ہے۔

بتاؤ تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب اجتہاد اور تقلید کے اس تسلسل میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، تو صاحبِ رسالہ (خجندی) کا یہ سوال کہ:

آخر لوگ فلاں اور فلاں امام سے پہلے کس چیز پر تھے؟ یہ ایک ایسا اعتراض ہے جو حقیقت و تاریخ دونوں سے منقطع ہے، اور کیا کوئی شخص انصاف کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ چاروں فقہی مذاہب کے مقلدین کسی گمراہی یا باطل میں مبتلا ہیں؟ حالانکہ وہ تو صرف اسی راہ پر ہیں جس پر ان سے پہلے اہلِ رائے یا اہلِ حدیث کے پیروکار تھے، اور وہی طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں جو ان سے قبل صحابہ کرامؓ کے مجتہدین و ائمہ کے مقلدین نے اپنایا تھا۔

تقلید سے مفر ممکن نہیں اور نہ کسی معیّن مذہب کی پیروی میں کوئی قباحت ہے

صاحبِ رسالہ کے دلائل کا خلاصہ اور حقیقت

ہم نے پہلے ہی وہ تمام دلائل پیش کر دیئے ہیں جو صاحبِ رسالہ (خجندی) نے اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لیے پیش کیئے اور ہم نے واضح کر دیا کہ کوئی منصف مزاج شخص ان دلائل کو (خجندی کے دعویٰ پر) حقیقی معنوں میں دلائل کے طور پر تسلیم نہیں کر سکتا، یہ محض اقوال ہیں جو (خجندی کے دعویٰ پر) نہ تو کوئی علمی استدلال قائم کر سکتے ہیں اور نہ ہی اہلِ علم انہیں تسلیم کرتے ہیں، اگرچہ صاحبِ رسالہ نے تو انہیں دلائل کا نام ہی دیا ہے مگر حقیقت میں یہ نام کسی بھی حقیقت یا صداقت میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔

مصنف کی غیر متعلقہ امور سے صرفِ نظر

ہاں جہاں تک اُن امور کا تعلق ہے جن پر ہم نے تفصیلی بحث یا رد نہیں کیا، وہ سب وہی تین بنیادی اصول ہیں جن پر تمام علماء کا اتفاق ہے اور جن کے نتائج اختلاف کے دائرے سے بالکل باہر ہیں، اسی وجہ سے ہم نے ان پر کوئی گفتگو نہیں کی کیونکہ اس پر بحث کرنا صرف وقت کا ضیاع ہے۔

مثبت اور مضبوط دلائل کی ضرورت

لیکن پھر بھی صرف یہ کافی نہیں کہ صاحبِ رسالہ کے دعوے ان کے کمزور دلائل کے رد پر ہی اکتفاء کریں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی طرف سے ایسے مثبت، واضح اور مضبوط دلائل بھی پیش کریں جو صاحب رسالہ کے خطرناک الزامات اور باطل دعوے کی بے بنیادگی کو ثابت کریں اصل حقائق کو صاف اور واضح انداز میں ظاہر کریں،

کیونکہ صاحبِ رسالہ جن دعووں کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ دراصل دو ایسے پہلوؤں پر مشتمل ہیں جو آپس میں مطابقت ہی نہیں رکھتے بلکہ میری تو سمجھ سے بالاتر ہے کہ دو متضاد دعوے ایک ساتھ صاحب رسالہ کے ذہن میں کیسے جمع ہو گئے۔

صاحبِ رسالہ (خجندی) کے دو متضاد دعوے

جیسا کہ ہم نے پچھلے صفحے پر ذکر کیا کہ مؤلفِ رسالہ کا موقف دو ایسے متضاد دعووں پر قائم ہے جن کے درمیان کوئی عقلی یا علمی تطبیق ممکن نہیں،

پہلا دعویٰ : تقلید مطلقاً حرام

خجندی اپنے رسالے کے مختلف مقامات پر بار بار یہ دعویٰ کرتا ہے کہ تقلید مطلقاً حرام ہے، اس کی دلیل وہ یہ پیش کرتا ہے کہ مجتہد معصوم نہیں، جبکہ کتاب وسنت معصوم ہیں، لہٰذا معصوم کی پیروی غیر معصوم

کی پیروی سے افضل ہے، مزید یہ کہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اجتہاد انتہائی آسان ہے اور اس کے لیے صرف چند معتبر کتب، جیسے موطأامام مالکؒ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود اور جامع الترمذی، کا مطالعہ کافی ہے۔

(ملاحظہ کریں رسالہ: ص12، 40)

دوسرا دعویٰ :

کسی معیّن مذہب کی پابندی جائز نہیں اسی کے ساتھ وہ یہ دوسرا دعویٰ بھی بار بار دہراتا ہے کہ مقلد کے لیے کسی معیّن مذہب کی پابندی جائز نہیں، اگر کوئی شخص کسی ایک مذہب کی پیروی کرے، تو وہ گمراہ یا الحمر المستنفرۃ (بھاگتی ہوئی گدھیوں) میں شمار ہوتا ہے۔ (ملاحظہ کریں رسالہ: ص24، 25)

دونوں دعووں کا باہمی تضاد

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تقلید مطلقاً ناجائز ہے کیونکہ یہ غیر معصوم کی پیروی ہے تو پھر کسی خاص نوعِ تقلید (یعنی تقلیدِ شخصی) سے منع کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اور اگر صرف تقلیدِ شخصی باطل ہے تو پھر تقلیدِ مطلق کو کلاًرد کرنا اور اتباعِ معصوم کو دلیل بنانا خود ایک داخلی تضاد ہے۔

اصل حقیقت کی وضاحت

مجھے معلوم نہیں کہ صاحبِ رسالہ کے ذہن میں یہ دونوں متضاد تصورات کس طرح جمع کیے گئے ہیں مگر میں قاری کے سامنے وہ دلائل پیش کروں گا جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ تقلید درحقیقت ناگزیر اور مشروع ہے مسلمانوں میں اس کا ثابت ہونا ایک مسلم حقیقت ہے۔ اسی طرح (میرے دلائل سے) یہ بھی واضح ہوگا کہ اگر کوئی مقلد چاہے کسی معیّن مذہب کی پابندی کرے تو اس پر کوئی گناہ یا حرمت عائد نہیں ہوتی۔

تقلید کی حقیقت و مشروعیت

تقلید سے فرار ممنوع اور یہ تمام مسلمانوں کے اجماع سے جائز و مشروع ہے، تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے کے قول کی پیروی کرے، بغیر اس کے کہ اسے اس قول کی صحت پر قائم دلیل کا علم ہو، البتہ اگر تقلید کی مشروعیت پر دلیل کا علم حاصل ہو تو وہ مقلد ہونے کے باوجود اپنی تقلید کے جواز کی دلیل جانتا ہے، مگر جس مسئلہ میں وہ مجتہد کی تقلید کر رہا ہے، اس کے دلائل کا علم اسے نہیں ہوتا۔

یہاں لغت میں بھی کوئی امتیاز نہیں، چاہے آپ اسے تقلید کہیں یا اتباع دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے اور لغوی اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی حقیقی فرق نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بدترین صورتِ تقلید کو اتباع کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے:

جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان سے بیزار ہو جائیں گے، جنہوں نے ان کی پیروی کی تھی اور عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے سب تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ (البقرہ:166)

قرآن کریم ہی میں ایک اور جگہ ارشادِ خداوندی:

وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی تھی کہیں گے کاش ہمیں ایک اور موقع ملتا تاکہ ہم بھی ان سے ایسے ہی بیزار ہو جاتے جیسے وہ ہم سے بیزار ہوئے، اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو ان کے سامنے حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔

غور کرو! اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہاں اتباع سے مراد وہ اندھی تقلید ہے جس کی کوئی شرعی بنیاد یا جواز نہیں، اب چاہے آپ اس بحث میں دونوں الفاظ (تقلید و اتباع) کے درمیان کوئی نیا اصطلاحی فرق وضع کر لیں لیکن حقیقت میں تقسیم دو ہی قسموں پر مشتمل رہے گی:

نمبر ایک: ایسا شخص جو دلائل کا علم رکھتا ہے اور ان سے احکام اخذ کرنے کا ماہر ہے تو وہ مجتہد ہے۔

نمبر دو: ایسا شخص جو دلائل کا علم نہیں رکھتا یا استنباط کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ مجتہد کا مقلد ہے۔

اس لیے الفاظ یا اصطلاحات کی کثرت سے حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اجتہاد نہ کرنے والے کے لیے تقلید کی مشروعیت کا سوال

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص جو اجتہاد (1) کی صلاحیت نہیں رکھتا یعنی شرعی دلائل سے خود حکم اخذ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، اس کے لیے تقلید کے مشروع اور واجب ہونے کی دلیل کیا ہے؟

(1)۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہماری یہ تمام گفتگو فروعی احکام (عملی مسائل) کے بارے میں ہے، جبکہ عقائد اور اصولِ دین کے باب میں تقلید اجماعِ امت سے ناجائز ہے، رہی یہ بات عقائد میں تقلید کیوں ناجائز ہے؟ تو وجہ اسکی یہ ہے کہ عقائد کے معاملے میں ظن (گمان) کافی نہیں بلکہ وہاں یقین اور قطعیت مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
} وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُولًا { (اس چیز کے پیچھے مت چلو جس کا تمہیں علم نہیں، یقیناً کان، آنکھ اور دل ان سب کے بارے میں باز پرس ہوگی۔) اور ان لوگوں پر نکیر فرمائی جنہوں نے اپنے عقائد میں گمان کی پیروی کی: (إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ) (یہ لوگ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور محض اٹکل پچو باتیں بناتے ہیں۔) یقین تک رسائی ذاتی تحقیق، غور و فکر، اور عقل و فہم کی خود مختاری کے بغیر ممکن نہیں، البتہ عملی احکام (فقہی مسائل) میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ظنِ راجح (غالب گمان) کے مطابق عمل کا پابند بنایا ہے، یعنی مجتہد کا اجتہادی ظن ہی شرعی دلیل قرار دیا گیا ہے، اور اسے لازم ہے کہ وہ اسی ظن کے مطابق فتویٰ دے اور عمل کرے، چنانچہ نبی کریم ﷺ جب کسی صحابی کو کسی علاقے میں دینی تعلیم دینے کے لیے بھیجتے، تو وہاں کے لوگ ان کے اقوال پر عمل کرتے اور انہی کی تقلید کرتے تھے، حالانکہ خبرِ واحد ظن پر مبنی ہوتی ہے، قطعیت پر نہیں، گویا آپ ﷺ کا مقصد یہ ہوتا کہ:

الجواب: اس کے کئی دلائل متعدد پہلوؤں سے واضح ہیں۔

پہلا پہلو: قرآنِ مجید سے دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :(فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ) یعنی: اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔(النحل:43)

تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت اُن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو نہ شرعی حکم جانتے ہیں اور نہ اس کی دلیل، ان کے لیے لازم قرار دیا گیا کہ وہ ان اہلِ علم کی طرف رجوع کریں جو شریعت کے احکام سے واقف ہیں، اسی بنیاد پر اصولیین کی اکثریت نے اس آیت کو اپنی پہلی دلیل قرار دیا ہے

کہ عامی (غیر مجتہد) پر مجتہد کی تقلید واجب ہے۔

اور اسی مفہوم کی تائید میں ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ

قرآنِ کریم سے دوسری دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ} [التوبہ: 122)

جب تمہیں کسی عالم کے قول یا تحقیق سے غالب گمان ہو کہ یہ حکم شرعی ہے، تو تم پر لازم ہے کہ اسی کے مطابق عمل کرو اور اسی پر قائم رہو، لہٰذا یہی وہ بنیادی فرق ہے جو عقائد (اصول) اور عملی احکام (فروع) کے درمیان ہے عقائد میں یقین ضروری ہے، تقلید نہیں چلتی، فروع میں ظنِ راجح کافی ہے، اور تقلید شرعاً مشروع و واجب ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو بیک وقت جہاد یا دعوت کے لیے نکلنے سے روکا، اور حکم دیا کہ ان میں سے ایک جماعت پیچھے رہ کر دین کی گہری فہم و فقہ حاصل کرے، تاکہ جب مجاہدین واپس آئیں تو یہ اہلِ علم و فقہ حضرات انہیں حلال و حرام اور احکامِ الٰہی سے آگاہ کریں، یہی آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ:

اُمت کے لیے ایک اہلِ فقہ طبقے کا وجود ضروری ہے، اور عوام الناس کا فریضہ ہے کہ وہ انہی سے دین سیکھیں۔ (دیکھیے: تفسیر الجامع لأحکام القرآن للقرطبیؒ، جلد 8، ص 293–294)

دوسرا پہلو : صحابہ کرام کے اجماع سے دلیل۔

اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام صحابہ کرامؓ علم و فقہ میں برابر نہ تھے، بلکہ ان کے مابین درجاتِ علمی میں تفاوت تھا، جیسا کہ ابنِ خلدون نے واضح فرمایا کہ:

تمام صحابہ اہلِ فتویٰ نہ تھے، اور دین ہر صحابی سے نہیں لیا جاتا تھا، ان میں مفتی و مجتہد صحابہ بھی تھے مگر ان کی تعداد کم تھی، جبکہ مستفتی و مقلد صحابہ کی تعداد اکثریت میں تھی، مزید برآں جو صحابی فتویٰ دیتے وہ سائل سے دلیل لازماً ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے قول کو بغیر دلیل ماننا صحابہ میں رائج و معروف تھا۔

رسولِ اکرم ﷺ کی عملی تائید

نبی کریم ﷺ خود بعض فقیہ صحابہ کو مختلف علاقوں میں مبلغ و معلم بنا کر بھیجتے، جہاں کے لوگ اسلامی عقائد، عبادات، معاملات اور احکامِ حلال و حرام سے ناواقف ہوتے، یہ صحابہ ان کو دین سکھاتے اور عوام ان کی ہدایت و تعلیم پر عمل کرتے، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ان فقیہ صحابہ کو کوئی نیا مسئلہ درپیش آتا جس میں قرآن یا سنت سے کوئی صریح نص موجود نہ ہوتی، تو وہ اجتہاد کرتے اور اس اجتہاد کے نتیجے میں جو حکم مستنبط کرتے اسی کے مطابق فتویٰ دیتے، اور لوگ ان کی تقلید کرتے۔ یہ طرزِ عمل خود صحابہ کے دور میں تقلید کے جواز اور عملاً رائج ہونے پر روشن دلیل ہے۔

استشہادِ امامِ غزالیؒ: امام ابو حامد الغزالیؒ نے اپنی مشہور اصولی کتاب

المستصفیٰ میں باب التقلید والاستفتاء کے تحت یہ اصولی نکتہ واضح فرمایا کہ:

العامي ليس له طريق إلى معرفة الأحكام إلا بالتقليد

یعنی: عامی کے لیے احکامِ شرعیہ جاننے کا کوئی راستہ نہیں سوائے تقلید کے۔

پھر فرماتے ہیں:

ہم اس بات پر دو طریقوں سے استدلال کرتے ہیں.

پہلا طریقہ اجماعِ صحابہؓ سے:

ان دو میں سے ایک دلیل اجماعِ صحابہؓ ہے کیونکہ یہ بات تواتر اور بدیہی علم سے ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ عوام کو فتوے دیتے تھے، مگر کبھی انہیں یہ نہیں کہتے تھے کہ:

تم خود اجتہاد کرو، یا دلیل تلاش کرو۔ بلکہ عام صحابہؓ وتابعینؒ اہلِ علم صحابہؓ سے مسائل دریافت کرتے۔ اور ان کے فتووں پر بلا دلیل عمل کرتے تھے، یہ طرزِ عمل اس بات پر واضح اجماع ہے کہ غیرِ مجتہد (عامی) کے لیے مجتہد کی پیروی کرنا نا صرف جائز بلکہ لازم ہے۔ (المستصفیٰ، ج2، ص385)

اسی طرح امام سیف الدین الآمدیؒ نے اپنی مشہور اصولی کتاب

الاحکام میں اسی حقیقت کو صراحت سے بیان کیا ہے کہ:

اجماع اس بات پر قائم ہے کہ صحابہ وتابعین کے زمانے میں جبکہ ابھی مخالف فرقے اور فتنہ انگیز گروہ پیدا نہیں ہوئے تھے عام مسلمان مجتہدین سے فتویٰ پوچھتے اور ان کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے، علماء ان کے سوالوں کے جواب دیتے مگر دلیل بیان نہیں کرتے تھے، اور نہ ہی کسی نے اس طرزِ عمل سے انکار یا منع کیا. لٰہذا یہ تمام طرزِ عمل اس بات پر اجماع ہے کہ عامی کے لیے مجتہد کی تقلید مُطلق طور پر جائز ہے۔

عہدِ صحابہ میں افتاء و تقلید کا نظام

دورِ صحابہؓ میں فتویٰ دینے والے اہلِ علم کی تعداد محدود تھی اور یہ وہ حضرات تھے جو فقہ، روایت اور استنباط میں ممتاز مقام رکھتے تھے، ان میں سب سے نمایاں نام درج ذیل ہیں:

چاروں خلفائے راشدینؓ۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ ابو موسیٰ اشعریؓ۔ معاذ بن جبلؓ۔ اُبی بن کعبؓ زید بن ثابتؓ رضوان اللہ علیہ اجمعین، یہ حضرات مفتیانِ صحابہؓ کہلاتے تھے جبکہ ان کے مقلدین و مستفتین یعنی وہ لوگ جو ان کے فتاویٰ پر عمل کرتے ان کی تعداد بے شمار تھی، یہ طرزِ عمل بتاتا ہے کہ عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں تقلید ایک معروف و جاری عمل تھا اور اس پر کسی نے نکیر نہیں کی۔

عہدِ تابعین میں اجتہاد کا پھیلاؤ

پھر تابعین کے دور میں فقہی اجتہاد کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا، اس وقت مسلمانوں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو صحابہ کرامؓ نے اپنایا تھا:

علماء مجتہدین اجتہاد کرتے اور عوام ان کی تقلید کرتی، البتہ اس دور میں اجتہاد دو بڑے فقہی رجحانات کی صورت میں ظاہر ہوا:

نمبر ایک: اہلِ رائے۔۔۔ جو عراق میں تھے (فقہ العراق)

نمبر دو: اہلِ حدیث۔۔۔جو حجاز میں تھے (فقہ الحجاز)

یہ تقسیم کسی فکری انتشار کا نتیجہ نہیں بلکہ اجتہادی طرزِ فکر اور استنباطی اسالیب کے فرق کی بنیاد پر تھی، جیسا کہ ہم پہلے ابنِ خلدونؒ کے قول کے ضمن میں اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں۔

مکتبِ رائے (فقہِ عراق) کے ائمہ و متبعین

عراق میں مکتبِ رائے کے نمایاں اور جلیل القدر ائمہ میں۔ علقمہ بن قیس النخعیؒ۔ مسروق بن الأجدع الهمدانیؒ ۔ابراہیم بن یزید النخعیؒ۔ سعید بن جبیرؒ شامل تھے، یہ حضرات فقہی استنباط، گہری رائے اور اجتہادی بصیرت میں ممتاز مقام رکھتے تھے، عراق اور اس کے گرد و نواح کے اکثر اہلِ علم و عوام انہی ائمہ کے فتاویٰ پر عمل اور تقلید کرتے تھے، اور اس طرزِ تقلید پر کسی نے نکیر یا اعتراض نہیں کیا۔

مکتبِ حدیث (فقہِ حجاز) کے ائمہ و متبعین

اسی طرح حجاز میں بھی مکتبِ حدیث کے جلیل القدر ائمہ و محدثین موجود تھے جن میں سرِ فہرست : سعید بن المسیبؒ (سید التابعین)۔ عروہ بن الزبیرؒ۔ سالم بن عبداللہ بن عمرؓ۔ سلیمان بن یسارؒ۔ نافع مولیٰ عبداللہ بن عمرؓ شامل تھے، یہ حضرات حدیث، آثارِ صحابہؓ، اور سنّتِ نبویؐ کے فہم میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، اور اہلِ حجاز و مدینہ کے اکثر لوگ ان ہی ائمہ کے اقوال و فتاویٰ کی تقلید کرتے تھے، ان کے بھی اس طرزِ عمل پر کسی محدث یا فقیہ نے نکیر نہیں کی، بلکہ یہ طرزِ تقلید اُس زمانے میں متفق علیہ اور معروف دینی عمل تھا۔

ائمہ کے باہمی مناقشات اور عوام کا طرزِ عمل

اگرچہ ان دونوں مکاتبِ فکر یعنی اہلِ رائے اور اہلِ حدیث کے ائمہ کے درمیان بسا اوقات علمی مناقشات، فقہی مناظرے اور استنباطی اختلافات ہوا کرتے تھے، لیکن یہ اختلافات صرف اہلِ علم کے دائرے تک محدود تھے، عوام الناس اور وہ طلبہ جو ان کے درجے سے کم علم رکھتے تھے، ان کے لیے یہ مناقشات کسی حیثیت کے حامل نہ تھے، وہ جس امام کو زیادہ فقیہ، معتبر یا اپنے علاقے میں موجود پاتے اسی کی تقلید کر لیتے اور ان کے اس طرز پر کسی مجتہد نے کوئی اعتراض یا انکار بھی نہیں کیا، کیونکہ مجتہدین کے باہمی اختلافات([1]) عوام

([1])۔ یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ائمہِ مجتہدین کے مابین جو اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ تضاد نہیں بلکہ اجتہاد کے پھولوں سے پھوٹنے والی خوشبوئے تنوع ہیں، کیونکہ اختلاف دو طرح کا ہوتا ہے: ایک اختلافِ تضاد، جو فکری ٹکراؤ پیدا کرتا ہے، اور دوسرا اختلافِ اجتہاد، جو فہم و بصیرت کی وسعت ظاہر کرتا ہے، اختلافِ تضاد ایسا ہے جیسے دن اور رات دونوں جو دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر ایک شخص کہے روزہ فرض ہے، اور دوسرا کہے فرض نہیں تو یہ تضاد ہے، کیونکہ یہ دو متقابل باتیں ہیں جن کا اجتماع محال ہے۔ لیکن اختلافِ اجتہاد کا معاملہ کچھ اور ہے، یہ اختلاف دراصل روشنی کے مختلف زاویوں کی طرح ہے سورج ایک ہی ہے مگر ہر دیوار پر اس کی کرن کا عکس جدا ہوتا ہے، دلائل ایک ہی ہوتے ہیں، مگر فہم اور ترجیح میں فرق آ جاتا ہے، اور اگر ہم قرآن و سنت کا مطالعہ انصاف کی نگاہ سے کریں، تو معلوم ہوگا کہ اختلافِ اجتہاد کی جڑیں خود وحی کے باغ میں پیوست ہیں، حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرت میں اس کے خوشبودار پھول بکھرے پڑے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کا اختلاف جب بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی، تو حضرت موسیٰؑ غضبناک ہوئے کہ حضرت ہارونؑ نے سختی کیوں نہ کی؟ اور حضرت ہارونؑ نے فرمایا کہ نرمی میں مصلحت تھی تاکہ قوم بالکل بغاوت نہ کرے، یہ دونوں طرز دراصل دو اجتہادی راستے تھے، ایک نبی نے غیرتِ دینی کے جوش کو ترجیح دی، دوسرے نبی نے اصلاحِ امت کے حلم کو مقدم رکھا، دونوں کے دلوں میں ایک ہی شعلہ جل رہا تھا دین کی حفاظت کا، اللہ تعالیٰ نے کسی کو ملامت نہیں فرمائی، البتہ برتری اس کو ملی جس کا اجتہاد حق کے زیادہ قریب تھا، یعنی حضرت موسیٰؑ کو، مگر غور کیجیے ! کسی کے اجتہاد کو خطا نہیں کہا گیا بلکہ دونوں نبیوں کو ان کے خلوص اور مقصد پر اجر دیا گیا، یہی تو ہے اجتہاد کی خوبصورتی اختلاف کے باوجود اتحادِ نیت، دو راستے ایک منزل۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا اختلاف قرآن میں ہے:

فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا (الأنبياء:79)

واقعہ یہ پیش آیا کہ: ایک شخص کی بکریاں دوسرے کے کھیت میں چر گئیں۔ حضرت داؤدؑ نے فیصلہ فرمایا کہ بکریاں تاوان کے طور پر کھیت والے کو دے دی جائیں۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ: نہیں بلکہ کھیت والے کو بکریوں کا دودھ اور نفع دے دیا جائے اور بکریوں والے سے کھیت درست کرایا جائے، پھر جب کھیت واپس اپنی پہلی حالت میں آجائے تو بکریاں واپس کر دی جائیں۔ کتنی باریک بات ہے! دونوں فیصلے عدل و حکمت سے لبریز، لیکن زاویۂ نگاہ مختلف ہے، اللہ نے کریم فرمایا: ہم نے سلیمان کو زیادہ صحیح سمجھ عطا کی مگر دونوں کو علم و حکمت دی، یعنی ایک نبی کو ثوابِ اجتہاد ملا، دوسرے کو ثوابِ اجتہاد مع الفہم الاصوب، یوں دین نے سکھایا کہ اجتھاد میں رائے دو ہو سکتی ہیں مگر اجر سب کا ہوتا ہے۔ یعنی دو راستے ایک منزل۔

صحابہ کرام کا اختلاف: غزوۂ بنی قریظہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَد العَصْر إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ (بخاری و مسلم) یعنی: کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ پہنچ کر۔ اب دیکھئے اختلافِ فہم کا حسن کچھ صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک ارشاد کو ظاہری حکم سمجھا، اور واقعی وہاں پہنچ کر نماز پڑھی، جبکہ دیگر صحابہ کرام نے سمجھا کہ یہ تاکید ہے جلدی پہنچنے کی، سو انہوں نے راستے میں وقت پر نماز ادا کر لی، جب رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے کسی کو ملامت نہ فرمائی۔ یہ ہے اختلافِ اجتہاد کی اصل روح دونوں گروہ درست نیت سے چلے، دونوں نے اتباعِ رسول ﷺ کا ارادہ کیا، اور دونوں مأجور قرار پائے۔ کسی نے اطاعت کے تقاضے کو ترجیح دی، اور کسی نے وقت کے التزام کو اور دونوں کا انجام ایک ہی ہوا رضائے مصطفی ﷺ. دو راستے ایک منزل۔ ائمۂ مجتہدین کے اختلافات انہی اجتہادی اصولوں پر ائمہِ کرام امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ جیسے مجتھدین نے بھی اپنے اجتہادات فرمائے، رفع الیدین، آمین بالجہر، ہاتھ باندھنے کی جگہ وغیرہ کے مسائل میں، یہ سب اختلافات اسی نورانی سلسلے کے تسلسل ہیں جو انبیاء سے صحابہ، تابعین سے مجتہدین تک جاری رہا، لہٰذا ان حضراتِ مجتہدین کے بھی یہ اختلافات تفرقہ نہیں، بلکہ رحمتِ شریعت کا رنگین گلستان ہیں، ہر پھول اپنی خوشبو رکھتا ہے کوئی خوشبو نرم ہے، کوئی تیز، مگر سب ایمان کے گلشن کو مہکا رہی ہیں، جو لوگ اِن اجتہادی اختلافات پر طعن کرتے ہیں در حقیقت وہ علم کی خوشبو سے محروم ہیں، ہر مجتہد نے اپنے فہم کے مطابق کتاب و سنت سے استنباط کیا اور سب کا مقصود ایک تھا رضائے الٰہی، بہر حال یہ اختلافِ اجتہاد دراصل وحدتِ مقصد کے مختلف راستے ہیں۔ منکرینِ تقلید کا عجب تماشا حیرت ہوتی ہے ان منکرینِ تقلید پر جو خود کسی امام کے پیرو نہیں، مگر ائمہ کے اجتھادی اختلافات پر سب سے زیادہ واویلا کرتے ہیں،

ان کی مثال اُس تماشائی کی سی ہے جو خود قافلے میں شامل نہ ہو مگر قافلے والوں پر چیختا رہے کہ تم مختلف سمتوں میں کیوں جا رہے ہو!

یا غیرِ مجتہدین کے لیے ذمہ داری، گناہ یا الزام کا باعث نہیں بنتے، بلکہ ان اختلافات کا مقصد تو علمی تحقیق و تنقیح ہوتا تھا، نہ کہ عوام کو اُلجھانا، اسی لیے امت میں تقلید کا یہ عمل ہمیشہ اجماعِ سکوتی کے ساتھ جاری رہا۔

تیسرا پہلو: عقلی دلیل

تقلید کے اثبات میں تیسری دلیلِ عقلی یہ دلیل اپنی نوعیت میں نہایت واضح اور قطعی ہے،

جیسا کہ علامہ شیخ عبداللہ دراز‌ؒ نے فرمایا کہ:

عقل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتا، اگر اس کے سامنے کوئی فرعی شرعی مسئلہ پیش آجائے تو اس کے لیے صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

پہلی صورت: یہ کہ وہ کسی حکم کا پابند ہی نہ ہو اور یوں وہ شرعی حکم کے بغیر زندگی گزارے لیکن یہ اجماعِ امت کے خلاف ہے کیونکہ کسی مسلمان کو شریعت سے آزاد نہیں سمجھا جاسکتا۔

دوسری صورت: یا پھر وہ کسی نہ کسی طریقے سے شریعت کے حکم کا پابند ہو جائے چاہے خود دلیل میں غور و فکر کر کے یا پھر کسی کا مقلد بن کے، اب ظاہر ہے کہ دوسرا راستہ ہی درست اور واجب ہے، کیونکہ

بھائی، جب تم نے سفر ہی نہیں چُنا تو قافلے کے راستوں پر کیوں خفا ہو؟ اصل مسئلہ تعصب کی آنکھ اور فہم کی محرومی کا ہے، ورنہ جو شخص علم کی روشنی میں دیکھتا ہے اُسے مجتہدین کے اختلاف میں نورِ اجتہاد اور رحمتِ بصیرت دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ائمہ کے اختلافات تضاد نہیں بلکہ دین کی وسعت، علم کی گہرائی اور رحمت کی کشادگی کی علامت ہیں، یہ اختلافات امت کے لیے بھٹکنے کا سبب نہیں بلکہ آسانی اور سہولت کا ذریعہ ہیں، لہٰذا جس نے علم کو انصاف کی آنکھ سے دیکھا اُس نے جانا کہ مجتہدین کے اختلافات میں کوئی اندھیرا نہیں، بس روشنی کے رنگ بدل جاتے ہیں کہیں صبحِ صادق کا نور، کہیں شام کی کرن، مگر دونوں سورج ہی کے پرتو ہیں، اور ان سب کی منزل ایک ہی ہے اور وہ ہے: رضائے الٰہی۔ (مترجم)

شریعت نے انسان کو بے راہ چھوڑنے کے لیے نہیں بھیجا بلکہ ہدایت کے نظام سے وابستہ رہنے کا حکم دیا ہے، اور یہ وابستگی دو ہی صورتوں میں ممکن ہے

: یا تو وہ خود براہِ راست دلائلِ شرعیہ کی تحقیق کرے، یا کسی ایسے صاحبِ نظر مجتہد کی تقلید کرے جس نے وہ تحقیق کر رکھی ہو،

تحقیقِ دلائل کا راستہ ہر شخص کے لیے ناممکن ہے

اب اگر ہر شخص کو خود قرآن و سنت سے استنباط و اجتہاد کا مکلف ٹھہرا دیا جائے تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے، کسان ہل چھوڑ دے، تاجر دکان بند کر دیں، معمار اینٹ رکھنا بھول جائیں، طبیب دوا بنانا ترک کر دیں، اور سب کے سب فقہ و اصول کے گہرے سمندر میں کود پڑیں، ایسا فرض کر لینا ناممکن ہے، لہٰذا تقلید ہی وہ شرعی و عقلی راستہ ہے جو انسان کو گمراہی سے بچا کر علم کی روشنی میں لے آتا ہے، اور یہی وہ عبادت ہے جس کا مکلف، جب اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتا ہو مأمور ہے (1) جب علماءِ امت نے قرآن، سنت اور عقل تینوں کے استدلال کو جمع کیا تو ان سب نے ایک ہی نتیجے پر اتفاق کیا کہ :

جو شخص اجتہاد کی منزل تک نہیں پہنچا اس کے لیے واجب ہے کہ وہ کسی صاحبِ بصیرت مجتہد کی تقلید ہے، یہی وہ علمی توازن ہے جس سے نہ شریعت میں ابہام رہتا ہے اور نہ عوام میں انتشار، اور اسی حقیقت کو امام شاطبیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف الموافقات میں نہایت جامع اسلوب میں یوں بیان فرمایا کہ :

فتاوی المجتهدين بالنسبة إلى العوام كالأدلة الشرعية بالنسبة إلى المجتهدين.

---

(1)۔ دیکھیے : تعلیق الشیخ عبد اللہ دراز علی الموافقات للشاطبیؒ، جلد 4، صفحہ 22۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : الآمدی، الغزالی، اور دیگر اصولیین کی مباحثِ تقلید و اجتہاد۔

یعنی: مجتہدین کے فتاویٰ عوام کے لیے اسی طرح حجت ہیں جیسے شرعی دلائل خود مجتہدین کے لیے حجت ہوتے ہیں۔

مقلد کے لیے دلائلِ شرعیہ کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے

اس کی دلیل یہ ہے کہ دلائلِ شرعیہ کا موجود ہونا یا نہ ہونا، مقلّد کے حق میں یکساں ہے، کیونکہ جب وہ ان دلائل سے کوئی علمی فائدہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا، تو ان میں غور و استنباط کرنا اس کا کام نہیں، بلکہ اس کے لیے ان دلائل میں غور کرنا ہر گز جائز بھی نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر (یعنی اہلِ علم) سے پوچھ لو۔ چونکہ مقلّد عالم نہیں ہوتا، اس لیے اس کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ وہ اہلِ علم سے سوال کرے، اور دینی احکام کے باب میں انھی کی طرف رجوع کرنا اس پر واجب ہے، چونکہ مقلّد خود اجتہاد و استنباط کا اہل نہیں۔ اس لیے اس کے لیے علماء ہی شارع (قانون ساز) کے قائم مقام ہیں، پس ان کے اقوال، مقلّد کے حق میں شریعت کے اقوال کے بمنزلہ ہیں۔

(الموافقات للشاطبیؒ: 4/290، 292)

ابن القیمؒ، شاہ ولی اللہؒ عز بن عبدالسلامؒ، اور ابن الہمامؒ کی تصریحات کی طرف یاد دہانی اب مناسب ہے کہ آپ وہ نصوص یاد کرو جو ہم نے پہلے ابن القیمؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، عز بن عبد السلامؒ، اور کمال بن الہمامؒ کے حوالے سے ذکر کی تھیں، کیونکہ یہ تمام دلائل صاحبِ رسالہ (منکرِ تقلید خجندی) کے اعتراضات کے رد میں وارد ہوئیں، اور یہ سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ

تقلید اُن لوگوں کے لیے شرعاً جائز بلکہ واجب ہے جو استنباطِ احکام اور اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے، چنانچہ جب آپ پر نقلِ صحیح، اجماعِ قطعی اور بدیہی عقل کی بنیاد پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ تقلید نہ صرف مشروع بلکہ واجب ہے، تو اب اس میں کیا فرق رہا کہ جس مجتہد کی تقلید کی جارہی ہے وہ:

کسی صحابی میں سے ہو، یا ائمۂ اہلِ رائے یا ائمۂ اہلِ حدیث میں سے، یا پھر ائمۂ اربعہ میں سے؟ کیونکہ یہ سب مجتہد ہیں، اور تقلید کرنے والا بہر حال اس مرتبے سے فروتر اور استنباط کی قدرت سے عاجز ہے۔

چاروں فقہی مذاہب کو بدعت قرار دینا علمی مغالطہ ہے

آخر اس بات کا مفہوم کیا ہے کہ چاروں فقہی مذاہب کا وجود بدعت ہے، اور ان کی پیروی و تقلید بھی ایک جداگانہ بدعت ہے؟ اگر ان چاروں مذاہب حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کی تدوین و تنظیم کو بدعت کہا جائے، تو پھر مذہبِ اہلِ رائے اور مذہبِ اہلِ حدیث کی بنیاد رکھنے کو بدعت کیوں نہیں کہا جاتا؟ کیا یہ دونوں مکاتبِ فکر اپنے اپنے اجتہادی مناہج اور اصولی مسالک پر قائم نہ تھے؟ پھر آخر بدعت کا تیر صرف ان ائمہ کی طرف کیوں پھینکا گیا جنہوں نے ان اجتہادی اصولوں کو علمی قالب اور فقہی تسلسل عطا کیا؟

صرف مقلدینِ ائمہ پر بدعت کا طعن ایک بے اساس الزام

اگر امام شافعیؒ یا امام ابو حنیفہؒ کے مقلد کو بدعتی کہتے ہو تو پھر عراق میں امام ابراہیم نخعیؒ اور حجاز میں امام سعید بن المسیّبؒ کے متبعین کس زمرے میں آئیں گے؟ کیا ان کے پیروکار بھی بدعتی تھے؟ بلکہ اگر منصفانہ نظر سے دیکھا جائے تو سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ عبد اللہ ابن عباسؓ، عبد اللہ ابن مسعودؓ یا اُمّ المؤمنین عائشہؓ کے طرزِ فقہ پر چلنے والوں کو کبھی بدعتی کسی نے بدعتی نہیں کہا، تو پھر انہی کے علمی منہج کو باقاعدہ اصولی قالب دینے والے ائمۂ اربعہ کے متبعین پر بدعت کا الزام کیوں؟ یہ فرق دراصل فہم و انصاف کا نہیں، تعصب

ومغالطے کا پیدا کردہ ہے، یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ آخر ائمۂ اربعہ نے ایسا کون سا عمل کیا جسے شرعی اعتبار سے بدعت کہا جاسکے؟ کیا انہوں نے شریعت میں کوئی نیا حکم داخل کیا یا سنتِ رسول سے انحراف کیا؟ نہیں، بلکہ انہوں نے تو اجتہاد واستنباط کے اسباب کو مضبوط کیا، شریعت کے نصوص کو ضبط وتدوین کے سانچے میں ڈھالا اور علمی اصول و قواعد مرتب کیے تاکہ فہمِ دین میں انتشار کے بجائے نظم پیدا ہو، تو کیا یہ کام بدعت ہے یا دراصل شریعت کی خدمت اور امت کی فکری وحدت کا ذریعہ؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ان ائمہ کی جدت وامتیاز صرف اتنا تھا کہ انہوں نے فقہ وسنت کو منضبط اور مدوّن کیا، دلائل واحکام کے استخراج کے لیے مضبوط اصولی مناہج قائم کیے اور اجتہاد کے دروازے کو عقل ونقل کی حدود میں متوازن رکھا، ان کی بدولت فقہِ اسلامی کو وہ پختگی نصیب ہوئی جو نہ صرف دین کی تعبیر میں وحدت کا ذریعہ بنی، بلکہ امت کی فکری اور عملی سمت کو بھی استقرار بخشا۔

اہلِ رائے واہلِ حدیث کے درمیان اعتدال کا قیام

ان ائمہ کی علمی مساعی نے ایک اور عظیم کام کیا کہ:

اہلِ رائے اور اہلِ حدیث کے مابین منہجی شدت وانقطاع کی خلیج کو کم کیا، دونوں مکاتب نے ان کے اصولوں کے تحت ایک متوازن علمی تفاعل پیدا کیا، جس کے نتیجے میں امت کے اندر فقہی تفریق کے بجائے فکری توازن اور ہم آہنگی نے جنم لیا، یوں ائمۂ اربعہ کا وجود بدعت نہیں بلکہ امت کے فکری وفقہی نظام کا ستون ہے، اور ان کی تقلید کو بدعت کہنا نہ صرف علمی کم فہمی بلکہ تاریخی ناانصافی بھی ہے۔

ائمۂ اربعہ کے مذاہب کی بنیاد کتاب، سنت اور اجماع پر ہے

چونکہ ان چاروں فقہی مذاہب کی بنیاد کتاب، سنت اور اجماع ہی پر قائم تھی، یوں ان مذاہب کی اصولی عمارت مضبوط ہوئی، ان کے اصول وفروع منقّح اور واضح کیے گئے اور علمائے امت نے ان پر غیر معمولی

علمی توجہ دی، ان کی جانچ پڑتال کی، ان کے مباحث کو مرتب کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دفاع واشاعت کا عظیم فریضہ بھی انجام دیا۔

فقہی مذاہب کی بقا اور ان کی علمی پشت پناہی

یہی وہ سبب تھا کہ یہ مذاہب نہ صرف باقی رہے بلکہ ان کی کتب عالمِ اسلام میں پھیل گئیں اور ہر دور کے علماء نے ان مذاہب کی حمایت اور تقویت میں اپنا کردار ادا کیا،

البتہ ایک امر پر تمام اہلِ علم کا اتفاق تھا کہ :

جو عالم خود اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو، دلائلِ شرعیہ کو سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو اور اپنی تحقیق پر اطمینان حاصل کر لے، اس کے لیے کسی امام کی تقلید لازم نہیں، بس یہی وہ نیا اور امتیازی پہلو تھا جس نے ائمۂ اربعہ کے فقہی مذاہب کو دیگر مذاہب سے ممتاز کیا، ان مذاہب نے علم و عمل کے درمیان ایک توازن پیدا کیا، جہاں مقلد کے لیے اتباعِ ائمہ مشروع قرار پائی اور مجتہد کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا گیا۔

منکرینِ تقلید کے دعوے بے بنیاد اور غیر علمی

اب بتاؤ، اس میں آخر کون سی بدعت ہے؟ وہ کون سی گمراہی ہے جو ان (ائمہِ اربعہ کے) لاکھوں مسلمانوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ جو انہی مذاہب کے متبع اور انہی اصولوں کے حامل ہیں؟ پھر کس علمی یا شرعی بنیاد پر اس رسالے کے مصنف (یعنی صاحبِ الکراس، خجندی) نے یہ دعویٰ کر ڈالا کہ :

یہ فقہی مذاہب بدعت ہیں اور ان کا تمسک تیسری صدی ہجری کے بعد پیدا ہونے والی گمراہی ہے؟ بلکہ وہ کس دینی دلیل کی بنیاد پر ان فقہی مقلدین کو وحشی گدھیوں (الحُمُرُ المُسْتَنْفِرَة) سے تشبیہ دینے کی جسارت کرتا ہے؟ بہر حال اب جبکہ میں نے تقلید کی حقیقت اس کی شرعی حیثیت، اور ائمۂ اربعہ کے فقہی

مذاہب کا مقام وامتیاز واضح کر دیا، اور یہ بھی بیان کر دیا کہ ان مذاہب سے پہلے مسلمانوں کی علمی روش کیا تھی، تو میں اب ہر منصف قاری کے سامنے چند سوالات رکھتا ہوں، میں خود ان کے جوابات دینے کی زحمت نہیں کروں گا، کیونکہ عقلِ سلیم اور دیانتِ علمی ہر عاقل و منصف قاری کے لیے کافی ہے کہ وہ صاحبِ رسالہ کے ان گمراہ کن دعووں کی بے بنیادگی اور اس کے حق سے انحراف کو بخوبی سمجھ لے۔

مصنف کی اگلے مسئلے کی طرف پیش قدمی

چنانچہ جب یہ حقیقت واضح ہو گئی، تو آیئے! اب ہم دوسرے مسئلے کی دلیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

مقلد کے لیے کسی مخصوص مذہب کی پیروی حرام نہیں

جب ہم اپنی پچھلی گفتگو میں یہ بات دلائل کے ساتھ ثابت کر آئے کہ عامی اور ایسا کم علم شخص جو اجتہاد و استنباط کے مرتبے تک نہیں پہنچا، اس کے لیے تقلید ہی لازمی اور واجب امر ہے، تو اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

کیا ایسے مقلد پر لازم ہے کہ وہ ہر روز اپنا امام بدل کر نیا امام اختیار کرے؟ یا یہ عمل ہر مہینے، ہر سال یا کسی مقررہ مدت میں کرنا ضروری ہے؟ اور اگر فرضاً ایسا کرنا واجب بھی ہو تو اس پر دلیلِ شرعی کیا ہو گی؟

جواب بالکل واضح ہے کہ: عامی اور کم علم شخص پر واجب ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق تقلید کرے جیسا کہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

{فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ} [الانبیاء: 7]

چنانچہ جو شخص اہل علم سے سوال کرے اور ان کی رائے یا فتویٰ کے مطابق عمل کرے، وہ دراصل اللہ کریم کے حکم کی پیروی کر رہا ہے، پھر چاہے وہ کسی خاص امام کے پابند ہوں یا نہ ہوں([1])اور چاہے اس پابندی کی بنیاد قربت، آسان رسائی، یا اس کے نظریات و مذہب پر اعتماد ہو، تقلید کی یہ حقیقت عامی کے لیے سب سے محفوظ اور یقینی راستہ ہے۔ لیکن اگر کسی مقلد نے یہ خیال کر لیا کہ وہ کسی خاص امام کے پیچھے لازمی طور پر جڑے رہے اور کبھی بھی اس کے علاوہ کسی دوسرے امام کی تقلید اختیار نہ کرے، تو یہ خطا پر ہے، اور اگر وہ یہ عقیدہ رکھے کہ یہ بات براہِ راست اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ حکم ہے، بغیر کسی مجتہد کی تحقیق یا استدلال کے، تو یہ اس کی صریح غلط فہمی ہے اور شرعاً قابلِ گرفت ہے، اسی طرح اگر کوئی مقلد یہ سمجھے کہ اُسے ہر دن یا ہر وقتی وقفے کے بعد امام بدلنا لازم ہے تو یہ بھی خطا ہے، اور اگر وہ یہ عقیدہ بھی رکھے کہ یہ بھی حکمِ خدا ہے، اور اس کے پیچھے کسی اجتہاد کرنے والے کے بہکاؤ کا بہانہ نہ ہو تو یہ بھی گناہ ہے، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے علاوہ چیزیں شامل ہو جاتی ہیں، یعنی مقلد کا اصل فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ ہر اس معاملے میں جس میں وہ دلائل کے فہم سے قاصر ہے، کسی مجتہد کی تقلید کرے، اللہ تعالیٰ نے مقلد پر اس سے زیادہ کوئی پابندی نہیں رکھی، یعنی نہ تو امام کو ہمیشہ بدلنا فرض ہے اور نہ ہی کسی ایک امام کے پیچھے لازماً جڑنا، یہی وہ حکم ہے جس پر علماء اور ائمہ متفق ہیں، اور اس کے متعدد دلائل موجود ہیں:

وجہِ اول : کسی ایک امام کے پیچھے لازمی جڑنے یا امام بدلنے کی شرط، تقلید اور پیروی کے اصل فریضے کے علاوہ اضافی حکم ہے، اور اضافی حکم کے لیے علیحدہ دلیل ضروری ہے اور ایسی کوئی دلیل نہیں، اصل نصوص صرف یہ بیان کرتی ہیں کہ جو شخص دلائل کو خود سمجھنے یا استنباط کرنے سے قاصر ہے، اسے کسی مجتہد کی

([1])۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

تقلید کرنا چاہیے، جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کے علاوہ کوئی بھی شرط یا حکم جیسے امام بدلنے یا ہمیشہ کسی ایک امام کے ساتھ رہنے کا الزام، نیا ایجاد اور بے بنیاد حکم ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں۔

رسولِ اکرم ﷺ کا واضح فرمان ہے کہ :

جو شرط کتابُ اللہ میں (یعنی شریعت میں) نہیں، وہ مردود ہے، چاہے وہ سو شرطیں ہی کیوں نہ ہوں۔ [1] عجیب بات ہے کہ رسالے کے مصنف نے کسی مخصوص فقہی مذہب سے وابستگی کو ناجائز قرار دینے کے لیے اُسی بات سے استدلال کیا ہے جسے ہم خود اس کے دعوے کے بطلان پر بطورِ دلیل کے پیش کرتے ہیں، یعنی وہ (خجندی) یہ کہتا ہے کہ :

مخصوص مذہب کی پابندی پر کوئی دلیل نہیں، مگر پھر اگلی سانس میں یہ حکم بھی صادر کرتا ہے کہ :
"مقلد ہر کچھ عرصے بعد اپنا امام بدلتا رہے"

گویا خود اپنے ہی قول کے خلاف جا بیٹھا اور اپنے استدلال کی تلوار سے اپنی ہی بنیاد کاٹ ڈالی، اگر شرعاً کسی چیز کے التزام پر دلیل نہیں تو پھر یہ کون سی منطق ہے کہ "نہ بدلنا" حرام اور "بدلنا" واجب ہو گیا؟ دونوں تو ایک ہی نوع کے التزام ہیں، بس ایک کو اُس نے نفی اور دوسرے کو اثبات میں چڑھا دیا، یہی تضاد بتاتا ہے کہ بات فہمِ دین کی نہیں بلکہ ضد کی بنیاد پر چل رہی ہے، ورنہ تو درحقیقت ایک مقلد پر جو تقلید میں معذور ہے بس اتنا واجب ہے کہ وہ جان لے کہ تقلید اس کے لیے شرعاً لازم ہے، اب اگر وہ یہ عقیدہ رکھے کہ اُسے

([1])۔اس حدیث کو بزار اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور بخاری و مسلم نے حضرت عائشہؓ سے اسی روایت کے قریب المعنیٰ ایک اور روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ درج ذیل ہیں: کیا بات ہے ان لوگوں کی جو ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتابُ اللہ میں نہیں؟ جو شرط کتابُ اللہ میں نہیں وہ باطل ہے چاہے وہ سو شرطیں ہی کیوں نہ ہوں۔

ایک ہی امام سے ہمیشہ وابستہ رہنا چاہیے اور کبھی اس سے ہٹنا نہیں چاہیئے، یا اس کے برعکس یہ گمان کرے کہ اسے ہر دن یا ہر کچھ عرصے بعد امام بدلنا چاہیے تو دونوں ہی صورتوں میں وہ غلطی پر ہے۔

ایسے شخص کو راہِ صواب پر لانا لازم ہے کیونکہ شرع نے تو نہ اس پر ایسا لازم کیا ہے نہ ویسا، البتہ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ شارعِ مقدس نے تو اس پر کسی ایک حالت کو لازم نہیں ٹھہرایا، نہ ہمیشہ وابستگی کو اور نہ بار بار تبدیلی کو تو وہ درست موقف پر ہے اب چاہے عملی طور پر وہ ایک ہی امام پر قائم رہے یا مختلف اوقات میں دوسرے ائمہ سے استفادہ کرے۔[1]

وجہِ ثانی: ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی دس قرأتیں رسولِ اکرم ﷺ سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں، ان میں سے ہر قراءت کے پیچھے ایک جلیل القدر امام ہے جس نے اسے سیکھا، پڑھا، پڑھایا اور اپنے تلامذہ کے ذریعے آگے پہنچایا، اب یہ مسلم حقیقت ہے کہ ہر مسلمان ان قرائتوں میں سے کسی ایک کے مطابق قرآن پڑھ سکتا ہے، اسی طرح جو شخص اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتا، وہ بھی چاروں فقہی مذاہب میں سے جس مذہب کا چاہے اتباع کر سکتا ہے، کیا کبھی کسی نے یہ کہا کہ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ہر دن ایک نئی قرأت اختیار کرے؟ یا ایک ہی قراءت پر قائم رہنا اس کے لیے ممنوع ہے؟ کیا امت میں کسی قدیم یا جدید عالم نے ایسا کہا؟ اور خود اسی رسالے کے مصنف سے پوچھا جائے:

---

(1)۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ تبدیلی خواہشِ نفس یا شرعی ذمہ داریوں سے بچنے کے جذبے سے نہ ہو اور نہ ہی کوئی شخص ایک ہی عبادت میں مختلف مجتہدین کے اقوال کو جمع کرے، کیونکہ جمہور فقہا و اصولیین کے نزدیک یہ طریقہ باطل ہے اس سے ایسی ملفق عبادت وجود میں آتی ہے جسے کوئی امام تسلیم نہیں کرتا، نیز جو شخص کسی نئے امام کی تقلید اختیار کرے اسے چاہیے کہ اس امام کے مسلک اور دلائل سے بخوبی واقف ہو۔

کیا وہ قرآنِ کریم روزانہ ایک نئی قرأت میں تلاوت کرتا ہے؟ یا کل کی قرأت کو آج ترک کر دیتا ہے؟ بتائیں تو:

آخر اس میں کیا فرق ہے کہ کوئی شخص فقہی ائمہ کی پیروی کرے یا قرات کے ائمہ کی؟ کیا یہ انصاف ہے کہ پہلا شخص تو اپنے امام کو بدلنے پر مجبور کیا جائے، مگر دوسرے کو اپنی قرات پر قائم رہنے کی اجازت ہو؟ شاید کے کچھ لوگ یہ کہیں کہ:

مسلمان اکثر اوقات ایک ہی قرات سیکھ پاتا ہے، باقی قراتیں سیکھنے کی نہ ہمت رہتی ہے نہ موقع.

تو ہم کہتے ہیں کہ:

یہی تو حال فقہی مذاہب کا بھی ہے کہ ایک عام مسلمان کے لیے چاروں ائمہ کے مذاہب پر دسترس حاصل کرنا ممکن نہیں، وہ تو بمشکل ایک ہی امام کے مذہب کو سمجھ کر اسی پر عمل کرتا پاتا ہے، پھر یہ کیسا انصاف ہے کہ قرات کے معاملے میں اس کی مجبوری کو تسلیم کیا جائے اور فقہ کے باب میں اسے موردِ الزام ٹھہرایا جائے؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ بحث عذر و مجبوری کی نہیں بلکہ دلیل کی ہے، اور ہمارے پاس کوئی شرعی دلیل موجود نہیں جو یہ لازم کرے کہ انسان کبھی اپنے امام کو بدلے اور کبھی نہ بدلے، نہ قرات کے معاملے میں اور نہ فقہاء کے بارے میں، لہٰذا دونوں صورتوں میں حکم یکساں ہے، جو اصول ایک پر منطبق ہوتا ہے وہی دوسرے پر بھی ہوتا ہے۔

تیسری جہت

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دورِ صحابہ کا زمانہ گزر چکا، پھر تابعین کا عہد بھی ختم ہوا، اور اس کے بعد ائمہ اربعہ کے تابناک ادوار آئے، مگر کسی امام سے یہ روایت نہیں ملتی کہ انہوں نے اپنے مقلدین یا عوام کو

کبھی اس بات سے روکا ہو کہ وہ کسی ایک امام یا مفتی کی پیروی کریں، اور نہ ہی کسی نے یہ کہا کہ لوگ ائمہ کے درمیان چکر لگاتے رہیں آج ایک سے فتویٰ لیں کل دوسرے سے، اور ہر کچھ عرصے بعد اپنے امام کو بدل ڈالیں۔ بلکہ حقیقت تو اس کے برعکس ہے ہماری معلومات یہ بتاتی ہیں کہ خلفائے اسلام خود اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ ایک خاص امام کو فتویٰ دینے کا منصب سونپیں، اور عوام کو رہنمائی کے لیے اسی کی طرف متوجہ کریں، تاکہ لوگ دینی معاملات میں انتشار کا شکار نہ ہوں، چنانچہ خلیفہ لوگوں کے سامنے اس امام کے نام کا اعلان کرتا، اور ہدایت دیتا کہ اہلِ شہر اپنے سوالات و فتاویٰ کے لیے اسی عالمِ دین سے رجوع کریں، بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خلیفہ دوسرے علما کو فتویٰ دینے سے روک دیتا، تاکہ عوام مختلف آراء کے تضاد میں الجھ نہ جائیں اور ان پر دینی معاملات میں الجھن پیدا نہ ہو، چناچہ مکہ مکرمہ میں عطاء بن ابی رباح اور مجاہد رحمہا اللہ فتویٰ کے منصب پر فائز تھے اور خلیفہ کے حکم سے منادی کرائی جاتی کہ:

لوگو! عطاءؒ اور مجاہدؒ کے سوا کوئی دوسرا شخص فتویٰ نہ دے۔([1]) یوں اہلِ مکہ ایک طویل مدت تک انہی دو ائمہ کے مذہب اور فتاویٰ پر کاربند رہے، اور عطاء و مجاہد یا کسی دوسرے امام نے اس طرزِ عمل پر نہ کبھی اعتراض کیا نہ ہی خلیفہ کو اس فیصلے سے باز رکھا، کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ایک ہی امام کی پیروی کرنا غلط ہے یا ایسا کرنا کسی گناہ کے مترادف ہے، اسی طرح بعض لوگوں کے دل حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی فتاویٰ سے مطمئن تھے، لہٰذا وہ اپنے تمام مسائل اور سوالات انہی کی خدمت میں پیش کرتے اور انہی کے فتاویٰ پر عمل کرتے، لیکن تاریخ کے کسی صفحے پر یہ بات مذکور نہیں کہ ابن عباسؓ یا کسی دوسرے صحابیؓ نے اس عمل پر نکیر کی ہو یا مقلد کو اس پر گناہگار ٹھہرایا ہو۔

([1])۔ شذرات الذھب لابن العماد، ج 1، ص 481۔

اسی طرح عراق کے اہلِ علم و عوام طویل عرصے تک حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے فقہی مکتبِ فکر سے وابستہ رہے، خواہ وہ براہِ راست اُن کی ذات سے اخذ کرتے ہوں یا اُن کے تلامذہ کے ذریعے اُن کے اقوال و فتاویٰ کی پیروی کرتے ہوں، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ علماء میں سے کسی ایک نے بھی اس التزام ووابستگی پر نکیر نہیں کی،

ایسے ہی اہلِ حجاز بھی ایک طویل زمانہ تک مذہبِ اہلِ حدیث پر قائم رہے، جو در حقیقت حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور اُن کے شاگردوں واصحاب کے طریقِ فقہ کی صورت میں نمایاں تھا، اور یہاں بھی کسی اہلِ علم نے ان کی اس پیروی یا التزام کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھا، یوں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ لاکھوں مسلمان خواہ وہ عام عوام ہوں یا علم و فقہ کے طلباء واساتذہ، چاروں ائمہ کے مذاہب میں سے کسی ایک کے متبع بن گئے، کسی نے سہولت کے پہلو مذھب سے اختیار کیا، کسی نے اقامتِ مقام (علاقائی رواج) کے لحاظ سے اور کسی نے اعتماد و اطمینانِ قلب کے باعث، کتبِ طبقات نے ان لاکھوں اہلِ علم کے اسماء و مراتب کو محفوظ کرر کھاہے، چنانچہ آپ کو ان کے تذکرے

الطبقات الکبریٰ للشافعیۃ از سبکی میں ملیں گے،

طبقات الحنابلہ از ابن رجب میں نظر آئیں گے،

طبقات المالکیۃ از برہان الدین المدنی میں درج ہوں گے،

اور طبقات الحنفیۃ از الحافظ القرشی میں محفوظ ملیں گے،

لیکن ان ہزاروں علما میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ مقلد کے لیے کسی خاص مذہب سے التزام جائز نہیں، بلکہ اس کے برعکس امام ذہبی رحمہ اللہ خود ان فقہاء کا ذکر مدح وستائش کے ساتھ کرتے ہیں

ان کے التزام کو مضبوطی و خلوص کی علامت قرار دیتے ہیں، البتہ یہ شرط ضرور عائد کرتے ہیں کہ اگر کسی کو حق ودلیل واضح ہو جائے، تو پھر تعصب کی بناپر اپنے امام کے قول پر اصرار نہ کرے۔

امام ذہبی رحمہ اللہ فقہاءِ مالکیہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

اگران کے قاضی اور مفتی خون وتکفیر میں جلد بازی سے محفوظ رہیں، تو یہ اتباع والتزام خیر اور فضیلت دونوں کا باعث ہے۔

اسی طرح وہ حنفی فقہاء کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

یہ لوگ گہری بصیرت، دقیق فہم، اور تیز ذہانت والے ہیں ان سے بھلائی اور خیر کی توقع کی جاتی ہے، بشرطیکہ وہ چالاکیوں، ربا کے حیلوں اور زکوٰۃ کے باطل کرنے جیسے فتاویٰ سے بچیں۔

پھر شافعی فقہاء کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

یہ لوگ سب سے زیادہ ہوشیار اور دین میں بصیر ہیں، ان کے مذہب کی بنیاد احادیثِ صحیحہ اور متصل روایات کی اتباع پر قائم ہے، ان کے امام (امام شافعیؒ) محدثین کے پیشوا اور ان کے زمرے کے سرخیل ہیں، ان کی خوبیاں بے شمار ہیں، لہٰذا اے طالبِ حق! اگر تم نے ان کے مذہب کو سمجھ کر اللہ کے لیے اس پر عمل اختیار کیا اور اپنے نفس کو جہالت سے بچایا تو یقیناً تم بھلائی پر ہو۔

اور حنابلہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:

ان کے پاس علومِ نافعہ کی کثرت ہے اور عمومی طور پر یہ لوگ دینداری میں ممتاز ہیں دنیاوی لحاظ سے ان کا حصہ کم ہے، لوگ ان کے عقائد پر اعتراض کرتے ہیں، انہیں جسمانیت (تجسیم) سے منسوب کرتے

ہیں، حالانکہ یہ الزام صرف چند نادر افراد پر صادق آتا ہے اور باقی سب اس سے بری ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو معاف فرمائے۔

پھر امام ذہبی رحمہ اللہ ان سب ائمہ و متبعینِ مذاہب کو نصیحت فرماتے ہیں کہ:

وہ اپنے ائمہ کے لیے متعصب اور غلو آمیز محبت کا رویہ اختیار نہ کریں اور اپنے مذہب کو باقی تمام مذاہب پر برتر سمجھنے کا اعتقاد نہ رکھیں، وہ فرماتے ہیں کہ:

یہ گمان نہ کرو کہ تمہارا مذہب تمام مذاہب سے افضل اور اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے، کیونکہ نہ تمہارے پاس اس بات کا کوئی یقینی ثبوت ہے اور نہ تمہارے مخالف کے پاس بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام ائمہ عظیم خیر و برکت پر ہیں ان میں سے جو کسی مسئلے میں درست ہوا اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور جو اجتہاد میں خطا کر گیا، اس کے لیے بھی ایک اجر ہے۔[1]

امام ذہبیؒ کی شہادت اور اس کا وزن

غور کیجیے، اے انصاف پسند قاری! یہ حافظِ کبیر شمس الدین الذہبیؒ کا کلام ہے جو امام ابن تیمیہؒ کے جلیل القدر شاگرد تھے، وہ چاروں فقہی مذاہب کے ائمہ کی مدح کرتے ہیں ان کے فقہاء کی تعریف کرتے ہیں اور اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ ان کے پیروکار اپنے ائمہ سے اخذ کرتے اور ان کے اجتہادات پر قائم رہتے تھے، امام ذہبیؒ نے نہ صرف ان کی تعریف کی بلکہ انصاف کے ساتھ یہ تنبیہ بھی کی کہ اندھی تقلید یا تعصب کے اندھے بہاؤ میں بہہ کر اپنے امام کے قول کو واضح اور صحیح دلیل پر ترجیح دینا درست نہیں، یہی وہ طبقاتِ شافعیہ، مالکیہ، حنفیہ اور حنابلہ ہیں، اور یہی وہ تابعین و صحابہ کا طرزِ عمل ہے جسے ہم تفصیل سے بیان کر

([1])۔ زغل العلم والطلب، ص14، 15، 16

چکے ہیں، یہ تمام شواہد اس بات پر کھلے الفاظ میں متفق ہیں کہ اگر کوئی مقلد کسی امام کو اختیار کرے اور اس کے مسلک سے وابستہ رہے تو اس میں نہ کوئی گناہ ہے، نہ ملامت، نہ ہی شرعی رکاوٹ بشرطے کہ وہ یہ عقیدہ نہ رکھے کہ اللہ نے اُسے خاص اسی امام کی تقلید کا مکلف بنایا ہے، اگر ایسا عقیدہ رکھے تو یہ بات قابلِ انکار ہے اور اسے تمام اہلِ اسلام رد کرتے ہیں۔([1])

([1])۔ کیا یہ تمام شواہد اس بات پر کافی نہیں کہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے ادوار میں ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے کسی ایک امام یا ایک مکتبِ فقہ سے وابستگی اختیار کی اور اس سے انحراف نہیں کیا؟ بلکہ اس کے برعکس یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی ایک امام یا مکتب سے وابستہ رہنا شرعاً جائز اور مشروع عمل تھا، جس پر نہ کسی نے ممانعت کی اور نہ ہی اس پر کسی کی طرف سے نکیر کی گئی، بلکہ اس کے برخلاف، یہی طرزِ عمل خود صحابہ و تابعین میں رائج رہا، تو پھر ان تمام حقائق کے باوجود اگر کوئی یہ کہے کہ: کسی خاص امام یا مذہب سے وابستگی بدعت ہے۔ تو یہ رائے محض ایجادِ باطل اور دین میں زیادتی کے مترادف ہے، اسی پس منظر میں شیخ ناصر (الالبانی) نے بحث کے دوران مجھ سے سوال کیا کہ: اس رسالے میں کہاں سے ثابت ہوا کہ لامذہبیت بدعت ہے؟ اور کہاں سے ثابت ہوا کہ صحابہ وتابعین میں کسی نے ایک امام کی تقلید کی ہو؟ میں نے ان سے سوال کیا کہ: کیا آپ نے یہ رسالہ دراصل پڑھا بھی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ: ہاں، اِن شاءاللہ پڑھا ہے۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ ان کا اِن شاءاللہ کہنا یقین کے لیے تھا یا محض تبرک کے لیے؟ اگر انہوں نے واقعی پڑھا ہوتا تو وہ ضرور دیکھ لیتے کہ مکہ میں عطاء بن ابی رباح اور مجاہدؒ کا فتویٰ دینا اور باقی ائمہ کا ان پر خاموش رہنا، درحقیقت اس بات پر اجماع ہے کہ کسی ایک امام سے وابستگی شرعاً جائز و مشروع ہے اور اس کے برعکس کہنا بدعت ہے، اگر انہوں نے یہ رسالہ واقعی غور سے پڑھا ہوتا تو انہیں یہ بھی نظر آتا کہ عراق کے لوگ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے فقہی طریقہ پر قائم رہے، اور حجاز کے لوگ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے طریقے پر اور کسی نے ان پر نکیر نہیں کی۔ یہ سب اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کسی ایک امام یا فقہی مکتب کی پابندی کرنا نہ صرف جائز بلکہ امت کا متفقہ طرزِ عمل رہا ہے، لہٰذا جو شخص ان تمام روشن دلائل کو نظر انداز کر کے یہ فتویٰ دے کہ: کسی ایک مذہب سے وابستگی حرام ہے۔ تو اس کا یہ دعویٰ خود بدعتِ کبریٰ ہے، جو شریعتِ اسلامی کے تسلسل اور وحدت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے خصوصاً اس زمانے میں جب اکثر لوگ اپنی خواہشات کو دین پر ترجیح دے رہے ہیں۔

تقلیدِ امام والتزامِ مذہب کا صحیح مفہوم

اب جبکہ ہم نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے جسے ہر انصاف پسند مسلمان بخوبی جانتا ہے کہ :

جو شخص درجہِ اجتہاد تک نہیں پہنچا اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی مجتہد امام کی پیروی کرے خواہ وہ ایک امام کا التزام کرے یا نہ کرے، تو اب ضروری ہے کہ ہم یہ بھی واضح کریں کہ کسی امام کی تقلید اور اس کے مذہب سے تمسک رکھنے کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان امام کی ذات سے وابستہ ہو جائے؟ یا اس کی شخصی خصوصیات کی بنا پر اس کی پیروی کرے؟ ہر گز نہیں معاذ اللہ

تقلیدِ امام والتزامِ مذہب کا صحیح مفہوم

اللہ کی پناہ! مسلمانوں میں بھلا ایسا کہنے والا کون ہو سکتا ہے!.

تمام مسلمان عہدِ رسالت ﷺ سے لے کر آج تک اِس حقیقت پر متفق ہیں کہ اللہ کی شریعت ہی وہ واحد حاکم و ناظم قانون ہے جو انسانوں پر نافذ ہے اور وہی ان کی زندگی کا چراغ، عمل کا معیار اور ہدایت کا سرچشمہ ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ اور سنتِ تکوینیہ نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ انسان علم و معرفت میں یکساں نہیں بلکہ ان میں تفاوت اور مراتب کا فرق رہے گا خصوصاً احکامِ شریعت کی معرفت کے باب میں لہٰذا ضروری ہوا کہ عامی و کم علم شخص، عالم کے دامن سے وابستہ رہے، اور عالم، اس سے بڑے عالم کی راہ پر چلے، تاکہ سب کے سب بالآخر ایک ہی سیدھی راہ پر جمع ہو جائیں وہی راہ جو اللہ عزیز و حمید کی ہے۔ یہی اصول ہمارے رسولِ اکرم ﷺ کی پیروی میں بھی کار فرما ہے، ہم حضور ﷺ کی اتباع اس اعتبار سے نہیں کرتے کہ آپ ایک انسانی وجود ہیں، بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے سچے رسول اور اُس کے پیغام کے مبلغ ہیں، اسی لیے یہ کہنا درست نہیں کہ "قرآن کی اتباع، سنت کی اتباع سے افضل ہے" کیونکہ یہ تصور اس گمان پر قائم ہے کہ اللہ کا کلام رسول کے کلام پر فوقیت رکھتا ہے، حالانکہ ہم رسول اللہ ﷺ کی اطاعت

دراصل اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کے طور پر کرتے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ اللہ کے نمائندہ، مبلّغ اور مبیّن ہیں، اسی نسبت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجتہدینِ امت اور سنتِ رسول ﷺ کے مابین جو تعلق ہے، وہ اسی نوعیت کا ہے جو رسولِ اکرم ﷺ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے یعنی:

رسول ﷺ اللہ کے احکام کے مبلغ و مبیّن ہیں، اور ائمہ مجتہدین، رسول ﷺ کے احکام کے شارح و فہم کنندہ ہیں۔

امام شاطبیؒ نے الاعتصام (ج3، ص250) میں اسی نکتے کو نہایت جامع اور پُر معنی انداز میں بیان فرمایا کہ:

عالمِ شریعت کی پیروی اس حیثیت سے کی جاتی ہے کہ وہ شریعت کا عالم اور اس کے مطابق فیصلہ کرنے والا ہے، نہ کہ کسی اور حیثیت سے۔ کیونکہ درحقیقت وہ رسولِ اکرم ﷺ کے مبلغ کے مقام پر ہوتا ہے اور رسولِ اکرم ﷺ بذاتِ خود اللہ عزوجل کے مبلغ اور اس کے حکم کے مبیّن ہیں۔ چنانچہ امت کے افراد اپنے امام یا عالم سے وہی علم لیتے ہیں جو اس نے رسول اللہ ﷺ سے اخذ کیا ہو، خواہ اسے یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ رسول ﷺ سے ثابت ہے یا غالب گمان ہو کہ یہ انہی سے منقول ہے، لیکن وہ اس کی پیروی اس وجہ سے نہیں کرتا کہ وہ ذاتی طور پر حاکم و متبوع ہے، کیونکہ یہ منصب کسی انسان کے لیے مطلق طور پر ثابت نہیں، یہ حق تو صرف اس شریعت کے لیے خاص ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اور وہ شریعت بذاتِ خود رسول اللہ ﷺ کے لیے مخصوص ہے، کیونکہ اسی نسبت سے آپ ﷺ کو عصمت و خطا سے حفاظت حاصل ہے۔

امام شاطبیؒ آگے فرماتے ہیں کہ:

شرعی احکام کا مکلف شخص تین حالتوں میں سے ایک حالت میں ضرور ہوگا:

پہلی حالت : یاتوانسان خود مجتہد ہو، اگر خود مجتھد ہے تواس پر لازم ہے کہ اجتھادی مسائل میں اپنے اجتہاد کے اس نتیجے پر عمل کرے جس کی طرف اس کے اجتھاد نے اسکی رہنمائی کی۔

دوسری حالت: یا پھر وہ بالکل غیر عالم اور ایسا مقلدِ محض ہوگا کہ اسے شرعی احکام میں خود کسی درجے کی معرفت حاصل نہ ہوگی، تو ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ کسی رہبر کی رہنمائی میں چلے، کسی عالم کے فیصلے پر اعتماد کرے، اور کسی صاحبِ علم کی اقتدا کرے، اور یہ بات بھی ظاہر و بدیہی ہے کہ وہ اسی کی اقتدا کرے گا جو علمِ شریعت رکھتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اسے یقین یا غالب گمان ہو جائے کہ فلاں شخص اس علم کا اہل نہیں تو پھر اس کی پیروی یا اس کے فیصلے پر انقیاد جائز نہیں، بلکہ کسی عامی یا غیر عالم کے لیے یہ بات عقلاً و شرعًا محال ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی تقلید کریں جس کے متعلق وہ جانتا ہو کہ وہ اس علم کا اہل نہیں، جس طرح کوئی مریض اگر سمجھ بوجھ رکھتا ہو اپنی جان ایسے شخص کے حوالے نہیں کرتا جس کے بارے میں وہ جانتا ہو کہ وہ طبیب نہیں، الّا یہ کہ وہ بے عقل یا مجنون ہو۔ ([1])

([1])۔افسوس ہوتا ہے کہ :آج کل بعض لوگ کسی عالمِ دین کے بجائے کسی انجینئر، پروفیسر یا یوٹیوبر وغیرہ سے شرعی مسائل معلوم کر رہے ہوتے ہیں، ارے بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کہ ؟ اگر بیمار پڑو تو کیا انجینئر کے پاس علاج کرواتے ہو؟ اگر نقشہ بنوانا ہو تو موچی کے پاس جاتے ہو؟ یا دوا کا نسخہ کسی استاد یا دفتری اہلکار سے لکھواتے ہو؟ نہیں، کیونکہ دنیاوی نقصان آنکھوں کے سامنے نظر آرہا ہوتا ہے، لیکن یاد رکھو! دین کا مسئلہ کسی غیر عالم سے پوچھنے کا نقصان آخرت میں ظاہر ہوگا، جب تلافی کی کوئی گنجائش نہ ہوگی اور افسوس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، (مترجم)

لہٰذا جب یہ بات طے ہو گئی، تو معلوم ہوا کہ عامی کا انقیاد مفتی کے لیے اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ وہ علمِ شریعت رکھتا ہے نہ کہ اس اعتبار سے کہ وہ فلاں شخص یا فلاں نام ہے،([1]) اور یہ اصول اتنا بدیہی اور متفق علیہ ہے کہ: اس کے خلاف میں نہ عقل کوئی راہ پاتی ہے، نہ شریعت کوئی اجازت دیتی ہے۔

درجاتِ فہم اور تقلید کا علمی اصول

تیسری حالت: تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اگرچہ اجتہاد کے مرتبے تک نہیں پہنچا لیکن وہ دلائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اوران کے مواقع و محل کو پہچان سکتا ہے، نیز اس کی فہم اتنی درست ہے کہ وہ راجح و مرجوح کے مابین معتبر اصولوں کے لحاظ سے ترجیح دے سکتا ہے، جیسے مناظرہ یا علمی تحقیق کے مواقع میں ہوتا ہے، تو اس کے بارے میں دو ہی احتمال ہیں:

یا تو اس کی یہ ترجیح اور نظر معتبر شمار کی جائے گی یا نہیں، اگر ہم اس کی ترجیح کو معتبر مان لیں تو وہ اس لحاظ سے مجتہد کے مشابہ قرار پائے گا، کیونکہ مجتہد بھی دراصل علمِ حاکم یعنی شرعی علم کا تابع ہوتا ہے اسی کی

([1])۔ یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ تقلید کا مقصد شخصیت پرستی نہیں بلکہ علم و بصیرت کی پیروی ہے، مقلد جب امام کی بات کو اختیار کرتا ہے تو وہ امام کے نام یا منصب کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ امام نے شریعت کے اصولوں میں گہرائی، نصوص میں مہارت اور اجتہاد میں بصیرت حاصل کی ہے، درحقیقت تقلید کوئی اندھی تابعداری نہیں، بلکہ ایک عقلی و شرعی شعور پر مبنی طرزِ عمل ہے، جب ایک عام مسلمان جانتا ہے کہ وہ خود براہِ راست دلائلِ شرعیہ سے احکام اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو عقل کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس فن کے ماہر کی رہنمائی قبول کرے جیسے بیماری میں انسان طبیب کی بات تسلیم کرتا ہے، یہاں اطاعت ڈاکٹر کی شخصیت کے لیے نہیں بلکہ اس کے علم و تجربے کے اعتماد پر ہوتی ہے، وہ اس لیے مانا جاتا ہے کہ وہ مرض اور علاج کے اسرار و رموز کو سمجھتا ہے، نہ کہ اس لیے کہ اس کی ذات کسی عقیدت کا مرکز ہے، اسی طرح تقلید کا مفہوم یہ نہیں کہ انسان امام کا غلام بن جائے بلکہ یہ کہ وہ اس کے علمی استحقاق اور اجتہادی اہلیت کا معترف ہو، مقلد امام کے نام یا نسبت سے نہیں بلکہ اس کے علم اور اصولی استدلال سے وابستہ ہوتا ہے۔ (مترجم)

طرف نظر رکھتا ہے اور اسی کی سمت متوجہ ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص اس کی مشابہت رکھے وہ بھی اسی حکم میں داخل ہو، اور اگر اس کی ترجیح کو معتبر نہ مانا جائے تو وہ لازماً عامی کے درجہ میں شمار ہوگا، اور عامی مجتہد کی پیروی دراصل اسی پہلو سے کرتا ہے کہ وہ علمِ حاکم کی سمت متوجہ ہوتا ہے اور مجتہد اسی علم کا نمائندہ و ترجمان ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص عامی کے درجے میں ہے وہ بھی حقیقت میں عالم کی پیروی اسی لیے کرتا ہے کہ وہ علمِ شرعی کا حامل ہے نہ کہ کسی اور وجہ سے، یہی مفہوم امام شاطبیؒ کے کلام کا حاصل ہے۔

لہٰذا اگر آپ نے یہ بات علم و انصاف کے ساتھ سمجھ لی، اور بغیر تعصب کے اس پر غور کیا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ صاحبِ رسالہ کا یہ قول کتنی عجیب اور شنیع جہالت پر مبنی ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ :

جان لو کہ برحق اور واجب الاتباع مذہب صرف سیدنا محمد ﷺ کا مذہب ہے، وہی امامِ اعظم ہیں جن کی اتباع لازم ہے۔([1]) تو جب اصل یہی ہے تو یہ مذاہب کہاں سے آئے؟ کیوں یہ امت میں پھیل

([1])۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ: ہم صرف رسولِ اکرم ﷺ کے مذہب کے پیروکار ہیں کسی امام یا فقہی مکتب کے نہیں۔ تو ان کا یہ جملہ بظاہر نہایت دینی غیرت اور خلوصِ نیت کی خوشبو لیے ہوئے محسوس ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ جہالت کے سب سے خطرناک پردوں میں سے ایک ہے، کیونکہ شریعتِ محمدیہ ﷺ کی تعلیمات ہر گز یہ نہیں کہ ہر شخص خود قرآن و سنت سے براہِ راست احکام اخذ کرنے لگے، بلکہ دینِ محمدی کی صحیح تعلیمات اس بارے میں یہ ہیں کہ انسان اُن اہلِ علم کی رہنمائی میں چلے جنہوں نے نصوصِ شرعیہ کے معانی و مقاصد پر عمر بھر غور و تدبر کیا، دین کے اصولِ استنباط کے فن میں مہارت حاصل کی اور قرآن و سنت سے احکام کے استخراج کا عملی ذوق پیدا کیا، اسی حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء کی آیت نمبر 7 میں ارشاد فرمایا کہ :
فَسْـَٔلُوٓا۟ أَهْلَ ٱلذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ یعنی: اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔ یہ آیت دراصل تقلید کی عقلی و شرعی اساس کو واضح کرتی ہے، قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ ہر فرد خود تحقیق و اجتہاد کرے بلکہ جسے علم حاصل نہیں، اسے اہلِ علم کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا، چنانچہ جو شخص اہلِ علم کی رہنمائی سے انکار کرتا ہے اور محض اپنے فہم کو قرآن و سنت پر حکم بناتا ہے، وہ دراصل نصوصِ شریعت اور قرآنی تعلیمات کے منہجِ فہم سے بغاوت کرتا ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کا مزاج یہی ہے کہ علم کی وراثت

گئے اور کیوں مسلمانوں کے ذموں پر لازم قرار پائے؟ پھر وہ انہی بنیادوں پر ائمہ کے پیروکاروں کو گالی گلوچ اور طعن و تشنیع کا نشانہ بناتا ہے، حالانکہ وہ اس حقیقت سے غافل ہے جسے ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے اسلامی تشریع کی تاریخ پر کچھ بھی مطالعہ کیا ہو کہ فقہی مذاہب کا ظہور کہاں سے ہوا اور ان کے وجود کی بنیاد کیا ہے جس کا ایک حصہ ہم اس رسالے میں پہلے بیان کر چکے ہیں۔

عوام الناس بعض اوقات یہ الزام دیتے ہیں کہ کسی امام کی پیروی اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ کسی امام کو سیدنا محمد ﷺ کے مذہب پر فوقیت دیتے ہیں اور یہ تصور بہت سے عوام میں سرایت کر گیا ہے جو اجتہاد اور تقلید کے حقیقی مفہوم و مذاہب کی نشو نما سے واقف نہیں ہیں، یہ فریب ان کے ذہنوں میں اس حد تک داخل ہو گیا کہ کوئی کہنے لگتا ہے:

بھائی! کیا ہم رسول اللہ ﷺ کے پیروکار ہیں یا شافعی کے؟ اور ان ائمہ کے مذاہب کی کیا حیثیت ہے رسولِ اللہ ﷺ کے مذہب کے مقابلے میں؟ کیا یہ وہ مغالطہ نہیں جس سے ہر وہ شخص جو علم، انصاف اور دین اللہ میں اخلاص رکھتا ہے، خود کو بچاتا ہے؟ کیا واقعی صاحبِ کرّاس (خجندی) کو یہ معلوم نہیں کہ مذاہب کی پیروی کا اصل مفہوم کیا ہے، جس کی وضاحت دیگر علماء نے سینکڑوں کتابوں اور مآخذ میں کی، اور تاریخ نے اسے اپنے مصادر میں ثبت کیا، تاکہ وہ جاہل ہونے کے بہانے عوام سے یہ عجیب و غریب بات کہے؟ اگرچہ وہ اس واضح حقیقت سے ناواقف ہو اور پھر بھی اس خطرناک دعوت کو آگے بڑھائے تو یہ نہایت افسوسناک اور شرمناک عمل ہے، اگر وہ اس حقیقت سے واقف ہو جیسا کہ ہر محقق اور اہلِ فکر جانتے ہیں پھر بھی اسے نظر

اہلِ علم کے ذریعے منتقل ہوتی ہے، اور یہی وراثت فقہی مکاتب اور ائمہ کی صورت میں امت کے اندر قائم رہی اور آج تک قائم ہے انشاءاللہ جب تک اللہ کریم نے چاہا رہے گی، لہذا نبی اکرم ﷺ کی اتباع در حقیقت انہی ائمہ و علماء کی معرفت سے ممکن ہے، جنہوں نے شریعتِ محمدیہ ﷺ کے اصول و فروع کو محفوظ، منقح اور منضبط کیا، ان کی پیروی کسی شخص کی نہیں بلکہ نبی ﷺ کی شریعت کی عملی پیروی ہے۔ (مترجم)

انداز کرے تا کہ اپنی بدعت کے لیے عوام میں جگہ پیدا کرے تو پھر یہ معاملہ اور بھی سنگین اور خطرناک ہو جاتا ہے۔

کب تقلید اور پیرویِ مذہب سے اجتناب ضروری ہے:

مقلد کے لیے قطع نظر اس کے مرتبے یا حیثیت سے، دو صورتوں میں اپنے امام کی تقلید اور پیروی سے اجتناب لازم ہے۔

پہلی صورت: اگر کسی مسئلے میں مقلد اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ اس مسئلے کے تمام دلائل سے آگاہ ہو اور جان لے کہ کس طرح سے حکم اخذ کیا جاتا ہے تو اس صورت میں اسے چاہئے کہ اس مسئلے میں اپنے اجتہاد کی رہنمائی کے مطابق عمل کرے اور اپنی علمی مہارت کو محدود نہ کرے تا کہ وہ صرف امام کے پیچھے چلتا رہے۔ اور اگر اس کی علمی قابلیت ایک سے زیادہ مسائل کو شامل کرنے کے قابل ہو، تو ہر مسئلے میں حکم اسی طرح ہو گا۔

دوسری صورت : حدیث کی روشنی میں اجتہاد سے رجوع

دوسری صورت یہ ہے کہ: جب مقلد کو ایسی حدیث مل جائے جو اس کے امام کے اجتہاد یا فتوے کے برخلاف حکم دیتی ہو اور وہ (مقلد) اس حدیث کی صحت و دلالت پر مکمل یقین حاصل کر لے تو ایسی صورت میں مقلد پر لازم ہے کہ وہ حدیث کی دلالت کے مطابق عمل کرے اور اپنے امام کے فتوے پر عمل کرنے کو ترک کر دے، یہ بات بالکل واضح ہے کہ چاروں مذاہب (شافعی، حنفی، مالکی، حنبلی) کے ائمہ ہمیشہ اپنے شاگردوں اور مقلدین کو یہ نصیحت کرتے تھے کہ اگر کسی صحیح حدیث کی روشنی اجتہاد کے برخلاف ہو تو حکم کی پیروی میں اس حدیث کی طرف رجوع کیا جائے، یوں حدیث کی پیروی بذاتِ خود ان چاروں ائمہ کے مذاہب کا جزو لازم اور مشترک ہے، اور یہ وہ اصول ہے جس پر وہ سب متفق ہیں اور عمل کرتے تھے۔

حدیث کی پیروی کے لیے ضروری شرائط

تاہم اس بات کے کچھ اہم شرائط ہیں جنہیں جاننا اور مراعات کرنا لازمی ہے، ہر وہ حدیث جو محقق یا طالب علم دیکھ لے اور اسے لگے کہ یہ امام کے اجتہاد کے برخلاف ہے ضروری نہیں کہ اس حدیث کی حقیقت میں بھی وہی دلالت ہو جو طالب علم نے سمجھ لی، اس لیے تحقیق اور احتیاط شرط ہے،

امام نووی نے اس ضمن میں کتاب المجموع میں واضح بیان کیا ہے کہ:

اور یہ جو شافعی نے کہا اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شخص جو کوئی صحیح حدیث دیکھے فوراً اسے شافعی کے مذہب کے برعکس سمجھ لے اور اس کے ظاہری حکم پر عمل کرے بلکہ یہ وہ شخص کرے جسے اجتہاد کی درجہ بندی حاصل ہو یا اس کے قریب ہو اور شرط یہ ہے کہ غالب اس کا یقین ہو کہ شافعی نے اس حدیث سے واقفیت نہیں رکھی یا اس کی صحت سے ناواقف رہا، یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شافعی کی تمام کتب اور ان کے شاگردوں کی کتب اور دیگر متعلقہ مصادر کا مطالعہ کر لیا جائے، یہ ایک سخت شرط ہے اور کم ہی لوگ اس شرط پر پورا اُتر سکتے ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ حضرت نے بہت سی احادیث کے ظاہری حکم پر عمل ترک کیا جب کہ ان پر دلیل موجود تھیں لیکن وہ یا تو منسوخ، محدود، یا بعض حوالوں میں مخصوص یا بعض تعبیروں کے تابع ہیں۔ [1]

---

(1) ۔المجموع للنووی: 64/1.

امام کے ترکِ حدیث کے اسباب

ائمہ مجتھدینِ کرامؒ بسااوقات کسی حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل ترک کردیتے ہیں کیونکہ اس کے پسِ پردہ مختلف اجتہادی وجوہات کارفرما ہوتی تھیں، علامہ ابن تیمیہؒ نے ان اسباب کو شمار کرتے ہوئے دس وجوہات ذکر کی ہیں، اور پھر ایک گیارھواں سبب مزید بیان فرمایا کہ :

یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مجتہد کے پاس کسی حدیث پر عمل نہ کرنے کی ایسی حجت ہو جس تک ہم نہیں پہنچ سکے کیونکہ علم کے مدارک اور دلائل کے پہلو بہت وسیع ہیں۔([1])

اجتہادی اسباب کی عدمِ موجودگی میں رویہ

تاہم اگر کسی محقق نے کسی امامِ مجتہد کے ترکِ حدیث کے اسباب کو تلاش کیا اور پھر بھی ان دس میں سے کوئی وجہ نہ پائی تو اب اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ صحیح حدیث کی دلالت کو یہ کہہ کر چھوڑدے کہ : شاید امام کے پاس کوئی ایسی دلیل ہو جسے ہم نہیں جانتے یا ممکن ہے انہوں نے کوئی ایسا عذر دیکھا ہو جو ہم سے مخفی رہ گیا ہو۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ خطا کا امکان علمائے مجتہدین کے فہم واجتہاد میں زیادہ ہوتا ہے جبکہ دلائلِ شرعیہ یعنی قرآن وسنت میں تحقیق و فہم کے بعد غلطی کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔([2])

تقلید کی مشروعیت اور التزامِ مذہب

([1])۔ابن تیمیہ، رفع الملام عن الأئمۃ الأعلام، ص31۔

([2])۔ابن تیمیہ، رفع الملام عن الأئمۃ الأعلام، ص31۔

لہٰذا واضح ہوا کہ جو شخص اجتہاد کے درجے تک نہیں پہنچا اس کے لیے تقلید شرعاً جائز و مشروع ہے اور یہ کہ کسی مقلد کا کسی مخصوص مذہب کو اختیار کرنا یا نہ کرنا دونوں صورتیں شرعاً ثابت اور معقول ہیں، ہم نے ان دلائل کو تفصیل سے اس انداز میں پیش کر دیا کہ اب ان میں نہ کوئی ابہام باقی رہا نہ کسی شبہے یا دُھندلے پن کی گنجائش رہی.

اے منصف قاری! اب اگر آپ تعصب اور نفس پرستی سے پاک ذہن کے ساتھ غور کریں تو یقیناً آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہی بات حق اور انصاف پر مبنی ہے۔

تعصب کی راہ کا انجام

لیکن اگر آپ کا دل عصبیّت اور خواہشِ نفس کے تابع ہے تو آپ کو یہ تمام وضاحتیں محض غیر مؤثر الفاظ محسوس ہوں گی اور آپ ان میں کسی اصلاح یا روشنی کو نہ پاؤ گے، درحقیقت ایسے شخص کا علاج دلائل سے نہیں، دعا سے ہوتا ہے، اسی لیے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم سب کو نفس کے فریب سے بچائے، ہمیں ہویٰ و ہوس کے راستوں سے محفوظ رکھے اور اپنی شریعت کے فہم میں اخلاص و انصاف کی توفیق عطا فرمائے۔

اگر تمام لوگ لامذہبیت کی وادی میں بہہ جائیں تو کیا ہوگا؟

اب جب کہ ہم نہایت وضاحت اور یقینی دلائل کے ساتھ یہ حقیقت (یعنی تقلید کی شرعی مشروعیت اور مذاہبِ اربعہ کی ضرورت) بیان کر چکے ہیں، تو شاید (کسی منکر تقلید، غیر مقلدین) کے ذہن میں یہ سوال اُبھرے کہ اگر ہم ان تمام دلائل کو پسِ پشت ڈال دیں اور اجتہاد کے نام پر لوگوں کو فقہی مذاہب کی رہنمائی سے آزاد کر کے اب بھی یہ کہیں کہ :

ہر شخص خود قرآن وسنت سے احکام اخذ کرے کسی امام کی تقلید نہ کرے، تو پھر کیا منظر پیدا ہو گا؟

میں آپ کے سامنے ایک مثال کے ذریعے اس سوال کا جواب رکھتا ہوں:

اگر لوگوں کو یہ دعوت دینی شروع کر دی جائے کہ وہ اپنے تمام تعمیراتی منصوبوں میں ماہر انجینئروں کی رہنمائی چھوڑ کر صرف اپنی ذاتی رائے پر عمارتیں بنائیں یا اپنی بیماریوں کے علاج میں ماہر اطباء کو چھوڑ کر اپنے طور پر علاج تجویز کریں اور اسی پر عمل کریں، اور اپنی صنعتوں، پیشوں و معیشت کے دیگر معاملات میں اہلِ فن و تجربہ کار لوگوں کی مہارت و معلومات سے بے نیاز ہو جائیں اور واقعی لوگ ایسا کر گزریں تو آپ خود اندازہ کیجئے کہ نتیجہ کیا ہو گا؟ یقیناً انجام تباہ کن ہو گا دنیا میں ایک ایسی ہولناک فوضی (انتشار و انارکی) پھیل جائے گی جو انسان کے تمدن و عمران (یعنی آبادی، تہذیب و ترقی) کو جڑ سے ہلا دے گی، لوگ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے گھر اجاڑ لیں گے اور اپنی جانیں برباد کر بیٹھیں گے، زراعت و صنعت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور معاشی تنگدستی و بربادی ان کا مقدر بن جائے گی، یہ سب تباہی اس لیے ہوئی کہ لوگوں نے اجتہاد کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر بغیر کسی اہلیت اور شرط کے استعمال کرنا شروع کر دیا، اور اللہ تعالیٰ کے اس ازلی و ابدی نظام کو بھلا دیا جو اس نے کائنات میں قائم کیا ہے کہ انسان ایک دوسرے سے تعاون، نصرت، تعلیم اور رہنمائی کے ذریعے ترقی کرتے ہیں۔ اور یہ بات کوئی پیچیدہ راز نہیں بلکہ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی بے خبر نہیں، اسے عام لوگ بھی جانتے ہیں حتیٰ کہ بچے بھی اس بات سمجھتے ہیں، بلکہ لامذہبیت (غیر مقلدیت) کے داعی خود بھی اس سے ناآشنا نہیں، مگر تعجب ہے کہ یہی لوگ اس اٹل قانون کو جب دین کے علمی اور فقہی دائرے میں لایا جاتا ہے تو کیوں بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں! یعنی جب معاملہ شریعت کے احکام اور حلال و حرام کے مسائل کا آتا ہے تو وہ اسی اصولِ عقل و فطرت کو بھلا بیٹھتے ہیں، شرعی احکامات کے معاملے میں (منکرینِ تقلید) کا یہ عدمِ فہم کیوں ہے؟ ہمیں بھی اس کی کوئی سمجھ نہیں آتی! لیکن حقیقت یہی ہے کہ اگر دنیا کے تمام لوگ اپنے اپنے شعبوں کے ماہرین سے بے نیاز ہو کر خود اپنی عقل و

تجربے سے انجینئرنگ، طب، زراعت اور صنعت کے میدانوں میں اجتہاد کرنے لگ جائیں تو جس تباہی اور افراتفری کا سامنا دنیا کو ہوگا بالکل ویسا ہی انجام اس وقت بھی سامنے آئے گا جب ہر شخص شریعت کے علوم اور احکامِ حلال وحرام میں بغیر علم، اہلیت اور رہنمائی کے خود رائے سے فیصلے کرنے لگ جائے۔

جامع فقہی میراث

آج امتِ مسلمہ کے پاس ایک مکمل اور منظم فقہی نظام موجود ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں انفرادی ہوں یا اجتماعی سب کو محیط ہے، یقیناً اس فقہ کو ائمہِ مجتہدین نے اپنی گہری بصیرت، وسیع علم اور دقیق اجتہادی کاوشوں سے مرتب کیا اور ان کے شاگرد علما نے اسے ضبطِ تحریر میں لا کر ایک مستحکم علمی سرمایہ بنا دیا، یوں آج یہ فقہی ورثہ ہمارے سامنے ایک جامع وزندہ نظام کی صورت میں موجود ہے، گویا وہ اپنی زبانِ حال سے ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ:

آپ اور اس فقہ کے عملی نفاذ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں بس آپ اسے اپنے دور کے تقاضوں اور اسلوب کے مطابق نظم وترتیب دے کر اپنے معاشرتی، عدالتی اور مدنی معاملات میں بروئے کار لاؤ!

بے لگام اجتہاد کے خطرات

لیکن اگر پھر بھی اس فقہی میراث کو پسِ پشت ڈال کر تمام مسلمانوں کو (منکرینِ تقلید کی ضد کے مطابق) بے مہار اجتہاد کے میدان میں اتار دیں تو انجام وہی ہوگا جو کسی عمارت پر طوفانی آندھی کے چلنے سے ہوتا ہے، یہ فقہی نظام جو صدیوں کے غور وفکر، علمی استقامت، اور دینی تجربے کا نچوڑ ہے ایسے بکھر جائے گا جیسے خشک تنکے کسی شدید ہوا کے جھونکے سے بکھر جاتے ہیں، پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ مستحکم فقہی عمارت جو کبھی دین کے توازن، ربط اور وحدت کی علامت تھی اب صرف کھنڈرات اور ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی

ہے، ایسی اینٹیں جن کا نہ کوئی ربط باقی رہا نہ ترتیب۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس نتیجے کا انکار سوائے کسی ضدی، متعصب یا خود فریبی میں مبتلا شخص کے کوئی نہیں کر سکتا۔

عوام کے لیے سہل راہِ عمل

آج ہر مسلمان کے لیے اپنے دین کے عملی احکام نماز، روزہ، زکوٰۃ، معاملات اور عبادات کو سمجھنے کا نہایت آسان راستہ موجود ہے، وہ یہ کہ چاروں معتبر فقہی مذاہب میں سے کسی ایک کے جامع و مختصر رسالے کا مطالعہ کر لے، ان کتب میں احکامِ شریعت کا خلاصہ اس انداز سے درج ہوتا ہے کہ عام شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے، اگر وہ ان کے دلائل و اسناد تک نہ بھی پہنچ سکے تب بھی اس پر کوئی ملامت نہیں کیونکہ وہ مجتہد نہیں بلکہ مقلد ہے۔ یہی طرزِ عمل کئی صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کا بھی تھا وہ مسائل کے دلائل میں نہیں الجھتے تھے بلکہ اہلِ علم سے ان کے نتائج سیکھتے اور ان پر عمل کرتے تھے۔

عقل پرستی کا مغالطہ

اب اگر آپ ہر مسلمان کو یہ حکم دیں کہ وہ خود اجتہاد کریں، دلائل میں غور و فکر کریں اور اُسے اُن فقہی کتابوں سے بھی محروم کر دیں جن کے ذریعے وہ حلال و حرام کے احکام آسانی سے سمجھ اور یاد کر سکتے ہیں، اور کسی امام ([1]) کے فہمِ دین کی پیروی کر کے عملی زندگی میں شریعت پر چل سکتے ہیں،

تو آپ نے در حقیقت اس سے صاف الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ :

([1]) ۔افسوس کہ لامذہبیت (غیر مقلدیت) کے ایک نمایاں داعی نے ان ہی فقہی کتابوں کو جو ائمہ اربعہ کے اجتہادات اور صدیوں کے علم و تدبر کا نچوڑ ہیں، استہزاءً زنگ آلود کتابیں (كُتُبٌ مُصَدِّيَةٌ) کہا گویا اُس نے علم و فقہ کی روشنی پر مٹی ڈال کر اپنی ہی فکری زنگ آلودگی کو ظاہر کر دیا۔

جب بھی تمہیں کسی دینی یا عملی مسئلے میں کوئی الجھن یا مشکل پیش آئے تو تمہارے لیے اللہ کا حکم اور شریعت کا فیصلہ وہی ہے جہاں تمہیں تمہاری اپنی رائے اور خواہشِ نفس لے جائے۔ اگر آپ کی یہی روش رہی تو پھر انتظار کرو اور دیکھو کہ کس طرح پوری شریعتِ اسلامی نام و رسم (صرف رسمی طور پر موجود، حقیقت سے خالی) تک محدود رہ جائے گی، ایک ایسا عنوان جس کے نیچے کوئی تفصیل نہ ہو، ایک ایسا کھوکلا نام جس کے پیچھے حقیقت نہ ہو اور ایک ایسی عمارت جیسا جا کا قبرستان، جس کی دیوار میں فقط ایک بند دروازہ اور اس کے ایک پیچھے ویران زمین جہاں درندے اور بھیڑیئے (وحشی جانور) آزاد گھومتے ہوں۔ اگر تم نے (عوام کو) اس فقہی ورثے اور ائمہ سے نکال کر نااہل لوگوں کی لکھی ہوئی اور ان کے اجتہادات (شرعی استدلالات) پر مبنی کتابوں کے سپرد کر دیا، اور لوگوں پر یہ لازم کر دیا کہ وہ انہی کی تقلید کریں تو تم نے اصل میں محض یہ کیا کہ انہیں ایک امامِ شافعی، ابو حنیفہ، مالک یا احمد رحمھم اللہ کی تقلید سے نکال کر کسی معاصر فقہی متفکر کی تقلید پر مجبور کر دیا، اس پابندی کا کوئی اور معنٰی حقیقی نہیں سوائے ائمہِ چارہ کے خلاف بغض و عداوت (نفرت اور دشمنی) اُن کے پیروکاروں کے خلاف کینہ اور کسی مخصوص شخص یا گروہ کی اجتہادات کو فروغ دینے کے بغض و عناد کے ساتھ۔ میں نے ایک مرتبہ ایک طالب سے پوچھا جو میرے پاس بیٹھا تشہد میں اپنی اُنگلی کو مسلسل ہلا رہا تھا کہ :

اپنی انگلی اس طرح کیوں ہلا رہے ہو؟ اُس نے کہا :

یہ سنت ہے، جو رسول ﷺ سے وارد ہے۔ میں نے پوچھا : وہ کون سی حدیث ہے؟ صحت کے لحاظ سے کس درجے کی ہے؟ اور کون سی نص اُنگلی کی اس مسلسل حرکت پر دلالت کرتی ہے؟ اُس نے کہا : مجھے نہیں معلوم، میں کسی سے پوچھ لوں گا! اگر وہ کہتا کہ :

میں اس معاملے میں حضرت امامِ مالکؒ کے مذہب کا مقلد ہوں تو اسے اطمینان ہوتا اور وہ اپنا فریضہ بغیر شک کے ادا کرتا رہتا۔ اگر کوئی شخص اپنی پوری زندگی صرف ایک استاد یا رہنما کی بات مان کر سیکھتا

رہے، تب بھی لوگ اسے یہ نہیں کہیں گے کہ آپ کو کسی خاص مذھب کی پیروی کرنا منع ہے، یہ وہی صورت ہے جو اکثر لوگ اس مذھب کے پیروکاروں کے لیے استعمال کرتے ہیں، لیکن یہاں یہ رویہ قطعی طور پر ناجائز اور تعصب پر مبنی ہے، کیا آپ نے تعصب کے اس بدترین اور خطرناک ترین اظہار کو ملاحظہ کیا؟([1])

([1])۔ ہمیں اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ ان لامذہبیوں (غیر مقلدین) میں سے بعض اپنی طرف سے کچھ اجتہادات بھی پیش کرتے ہیں جن میں وہ عوامی اجماع (مسلمانوں کی عمومی رائے) کے برخلاف رائے رکھتے ہیں اور بسااوقات بعض جگہ دوسروں کے ساتھ اتفاق بھی کر لیتے ہیں یہ چیزیں ہمارے لیے بنیادی مسئلہ نہیں ہیں، ہم تو حسنِ ظن رکھتے ہوئے یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ممکن ہے انہوں نے بعض فقہی مسائل میں محنت کی ہو اور اپنی سمجھ کے مطابق اجتہاد (اگرچہ مصنفِ کتاب کا حسنِ ظن ہے فی الحقیقت محال ہے) کیا ہو، اسے ہم کم از کم اُن کے ذاتی اعتقاد کے طور پر قبول تو کر سکتے ہیں، ہم ان کے بعض نظریات کو رد کر سکتے ہیں، بعض میں ہم وہی رائے پسند کریں جو عوامی فقہ نے اختیار کی ہے اور بعض میں ان کے اجتہادات کو تسلیم بھی کیا جا سکتا ہے، یہ تمام بحثیں محض بھائی چارہ اور علمی مباحثے (تعلیمی اور فکری تبادلہ) کی نوعیت کی ہوں گی اگر خیال موقع فراہم کرے، مگر ہم کسی کی اس رائے کو بنیادِ استنکار (نفی یا مخالفت) یا ہنگامہ وجذباتی اعتراض کا سبب نہیں بناتے، جی ہاں... ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ کوئی شخص تشہد میں انگلی ہلانا پسند کرتا ہے یا تراویح کو آٹھ رکعت سمجھتا ہے یا کسی مذہبی رائے میں وہ بات رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ عمدہ طور پر اپنے عمل میں خلل ڈالتا ہو ایسا شخص اگر چاہے تو اپنی رائے خود اختیار کرے، یہ تاریخی جارحیت (ماضی کی مبالغہ آمیز تنقید) نہیں کہ کوئی شخص کچھ مسائل میں اجتہادی رجحان اختیار کرے، خواہ وہ واقعی اجتہاد کرنے کے اہل ہوں یا نہ ہوں، اس لیے بعض لوگوں نے بعض مسائل پر خود کو متمکن (ماہر اور قابل) سمجھ کر مخصوص طریقے اختیار کیے ہیں، یہ بات تاریخی طور پر غیر عجیب ہے، لیکن جس چیز کے ہم مخالف ہیں اور جس پر ہمارا غم ہے، وہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی منتخب کردہ آراء کو ہتھیار بنا لیتے ہیں اور انہی ہتھیاروں سے ائمہَ مذاہب پر حملہ کرتے ہیں، اُن کے مابین مضبوط رشتوں کو کاٹتے ہیں اور ان دلائل کو بنیاد بنا کر مساجد و محلے میں فتنہ (فساد واختلاف) برپا کرتے ہیں جیسا کہ اکثر جگہوں پر دیکھا جاتا ہے کہ، انہوں نے دعوت اللہ سے روگردانی کی اور گمراہوں کی اصلاح چھوڑ کر اپنے آپ کو محض اس کام کے لیے وقف کر دیا کہ جو بھی مؤمن اُن سے اختلاف کرے یا کسی امام کے مذھب کی تقلید کرے، اُس کے ساتھ یہ (غیر مقلدین) انتقامی اور ہنگامہ خیز مباحثہ (شدید مباحثہ اور الزامات) شروع کر دیتے ہیں اُنہیں ضلال (گمراہی) کا مرتکب ٹھہراتے اور ان کے ائمہ کو جہالت (نادانی) کا لقب دیتے ہیں اور اُن کی کتب کو زنگ آلود کہہ کر بدنام کرتے ہیں! اگر کسی کے ہاتھ میں تسبیح ہو اور وہ تسبیح پر اپنے اذکار کر رہا ہو تو یہ لوگ اُس پر تنقید کرتے ہیں اور اسے ضلال میں شمار کرتے ہیں، اسی طرح اگر کوئی

مؤذن علناً نمازِ رسول ﷺ کے استحباب (مسنون اعمال) کے کثرت میں اذان کے بعد دعا پڑھ دے تو وہ اسے شرک کے الزام سے ڈراتے ہیں، لوگوں نے اگر اپنی مسجد میں بیس رکعت تراویح ادا کی تو انہوں نے مسجد میں ایسے ہنگامے کھڑے کیے کہ وہاں فساد برپا ہو گیا اور میں (مصنف) آج بھی اُس رات کو یاد کرتا ہوں جب رمضانُ المبارک کی ایک شام مجھے پندرہ سے زائد عوامی افراد ملنے آئے جن کے چہروں اور آوازوں پر جھگڑے کی عکاسی تھی، وہ میرے پاس یہ اپیل لے کر آئے کہ اُن کے علاقے کی مسجد میں ایک ایسا شخص ہے جس نے تراویح کے اضافے کو حرام قرار دیا اور اس نے مسلسل لوگوں کو ستایا جس کی وجہ سے مسجد میں فتنے نے جنم لیا اور بالآخر اللہ کی مسجد ایک شیطانی جنگ کا میدان بن گئی، میں پوچھتا ہوں کہ :

آخر ان لوگوں کو کیا پتہ چلتا ہے، اگر یہ لوگ تراویح اپنی مراد کے مطابق (8 رکعت) پڑھیں اور ہم بھی جیسا چاہیں ویسا کریں تو آخر یہ لوگ کیوں ہمیں اپنی رائے پر پابند کرنا چاہتے ہیں؟ کیا ان کا مقصد یہ ہے کہ خود کو یہ لوگ کسی امام کی تقلید کے بغیر قرآن و حدیث سے احکام نکالنے کی استطاعت رکھنے والے ظاہر کریں؟ ہم نے تو انہیں چھوڑ دیا ہے، چاہیں تو وہ اپنی اسی (خیالی) رائے پر قائم رہیں اور اسی کے مطابق عمل کریں، انہیں اپنی الگ مذہب سازی کرنے دیجیے، مرتکز کہیں، یا اپنے آپ کو جس شغل میں چاہیں مصروف رکھیں، مگر جب اُن کا یہ ضدی رویہ دوسروں پر عتاب اور توہین کرنے کی شکل اختیار کرے گا تو یہ ناقابلِ قبول ہے۔ ورنہ ہم تو کبھی انکی اپنی مرضی کی راہ میں روکاوٹ نہیں بنے، وہ چاہیں تو وہ اپنے لیے ایک نیا بلند پایہ مذہب ایجاد کر لیں، جسے وہ چاروں (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) جیسے معتبر مذاہب کے برابر لا کر کھڑا کریں، اپنے چند مسائل منتخب کریں، اور انہی مسائل میں آزادی سے عمل کریں، مگر سوال یہ ہے کہ پھر بھی آخر کیوں وہ دوسروں کے بارے میں جہالت، تمسخر اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کرتے ہیں؟ کیا وہ اپنی زبانوں کو اس قدر بے لگام رکھتے ہیں کہ ائمہِ چارہ اور ان کی کتابوں واجتہادات کے بارے میں طنز و توہین کریں؟ اور کیوں وہ لوگ (اپنے ناقص فہم سے) ابو حنیفہؒ کے کون نقائص یا کمزور پہلو تلاش کرنے اور انہیں بار بار دہرانے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں؟ وہ امامِ شافعیؒ حضرت کی مثال دیتے ہیں کہ انہوں نے کسی خاص موقع پر نکاح کی قبولیت کا فیصلہ دیا، لیکن اگر وہ امامِ شافعیؒ حضرت کی کتابِ الاُم میں اس بحث کو پڑھ لیتے تو اپنی لاعلمی پر شرمندہ ہو جاتے، کچھ لوگ مثلاً شیخ ناصر البانی وغیرہ یہ کہیں گے کہ :

خدا کی پناہ !.... ہم ائمہ کا احترام کرتے ہیں اور اُن کے مذاہب کو بدنام نہیں کرتے ! اگرچہ وہ (البانی) اپنی بعض مجالس میں یہ کہہ بھی دیتے ہیں مگر حقیقتاً اُن کے افعال ان کے بیانات کے منافی ہوتے ہیں، جو شخص واقعی ائمہِ چارہ کا احترام کرتا ہے وہ اس قسم کی باتیں اُن کے بارے میں نہیں کہتا، مثلاً کوئی شخص نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وارد شدہ احادیث سے متعلق غیر متعلقہ عبارات پڑھ کر یہ ثابت کرے کہ عیسیٰ علیہ السلام ہمارے شریعت کے تابع ہیں اور ہمیں انہی کی پیروی کرنی چاہیے، پھر کھلے عام یہ بیان کرے کہ نہ انجیل نہ فقہ حنفی، ذرا غور تو کیجیے !. اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ فقہِ حنفی کو انجیل جیسا سمجھا جا

لہٰذا کون سا منصف انسان بوجہِ ان دلائلِ قاطعہ کے جو ہم نے پیش کیے ہیں کہ اگر کوئی فرد اجتہاد کے درجے تک نہ پہنچ سکتا تو اُسے مجتہدین میں سے کسی ایک کی تقلید کرنی چاہیے پھر بھی ان دلائل کو ٹھکراتا

رہا ہے، یعنی ایسی چیز جو شریعتِ اسلام سے بالکل الگ ہے، کیا کوئی ایسا متقی مسلمان ہوگا جو یہ نہ جانتا ہو کہ فقہ حنفی محض کتاب اللہ یا سنتِ رسول سے نکالے گا احکام کا نتیجہ ہیں یہ قیاس اور استنباط کے ذریعے اخذ کی گئی شریعت کی صورت ہے، جسے امام ابو حنیفہؒ نے اسی سبب سے اللہ کی رضا کے نزدیک قدم رکھا اس نے قرآن و سنت کے احکام کو واضح کرنے میں حصہ ڈالا، نہ کہ شریعت کے خلاف کوئی نئی کتاب متعارف کروائی، چاہے وہ کسی مقام پر خطا کریں یا صحیح ہوں یہ خطا و صواب تو (فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق) اجتہادی عمل کا حصہ ہیں، پھر وہ کون سا شخص تھا جس نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام ایسے کمزور ہوں گے (معاذ اللہ) کہ وہ قرآن و حدیث سے احکام نہیں نکال سکیں گے اور مجبور ہو کر انہیں امام ابو حنیفہ کی پیروی کرنی پڑے گی؟ کیا واقعی کسی نے ایسی بات کہی؟ ممکن ہے کوئی ذہنِ ناپختہ ایسا کہہ دے مگر یہ علمی اور معقول بحث نہیں، عملی اور علمی طریقہ کا تقاضا یہ ہے کہ شیخ ناصر کو وہ شخص اور جہاں اس نے یہ دعویٰ کیا وہ حوالہ بتانا چاہیے، پھر اس کا سائنسی اور منطقی مزاحمتی جواب دے، یعنی یہ ثابت کرنا کہ عیسیٰ علیہ السلام جیسی نبوتِ کریمہ کے لیے نصوص و دلائل سے حکم اخذ کرنا مشکل تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی شانِ نبوت اس چیز کی مانع نہیں کہ وہ شریعت سے براہِ راست مسائل نکالیں،

لہٰذا (البانی کا) یہ کہنا کہ فقہِ ابو حنیفہ بالکل غیرِ شرعی ہے اور انجیل جیسی چیز ہے، یہ نہایت غلط اور غیر معقول الزام ہے

،اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کتابِ مختصر صحیح مسلم پر جو شیخ ناصر نے تبصرہ کیا ہے اُس میں ایسے الفاظ ہیں جنہیں بعض محققین نے خطرناک کہا، ناشر کو بھی کہا گیا ہے کہ وہ ان جملوں کو آئندہ طبعات سے حذف کروائے، اب ہم نہیں جانتے کہ ناشر کیا کرے گا : آیا وہ وفاداری کی راہ اختیار کرے گا اور جو کچھ مفسر (شیخ ناصر) نے لکھا ہے اسے بغیر تبدیلی کے چھاپے گا، خواہ اس میں ایک سطر بھی خطرناک لفاظی ہو؟ یا پھر وہ شریعت اللہ اور امتِ مسلمہ کے حق کے تقاضے کو مقدم رکھے گا اور اس ایک سطر کو حذف کر کے شریعت کے مفاد کو بچائے گا؟ ہم نہیں جانتے مگر دوسری طباعت کے ظاہر ہوتے ہی حقیقت واضح ہو جائے گی اور ہمیں موقع ملے گا کہ ہم اس پر مفصل تبصرہ کریں۔

ہے اور سب لوگوں کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ سب خود اجتہاد کریں خواہ وہ اس کے اہل نہ ہوں اور ائمہِ مجتہدین کی تقلید سے آزاد ہو جائیں حالانکہ کروڑوں مسلمانوں نے قبل ازیں انہی ائمہ کی تقلید کی ہوئی ہے اور یوں وہ لوگ جو کتاب وسنت سے حلال و حرام کے احکام نکالنا چاہتے ہیں اپنے اپنے ذوق و تصور کے مطابق نکالیں اور اس طرح شریعت اللہ کو اپنے باگِ خیالات اور وھمیات (خیالی اور غیر حقیقی تصورات) میں چور چور کر دیں، تو کیا کوئی منصف یہ قبول کر سکے گا؟

اور کون ایسا شخص ہے جو یہ نہیں جانتا کہ اگر یہ دروازہ سب کے سامنے کھول دیا جائے یعنی ہر طبقہ ہر کسی کو بلا امتیاز اجتہاد کی دعوت دے دی جائے تو یہ دراصل اُن لوگوں کو موقع فراہم کرنے کے مترادف ہوگا جو شریعت اور اسلام کے دشمن ہیں کہ وہ اسے اجتہاد کے بَلو (چھری) سے چیر ڈھونڈیں؟ اور کیا ہماری عربی دنیا کا کم از کم کسی حد تک کوئ باخبر مفکر ایسا ہے جو یہ نہیں جانتا کہ برطانیہ نے مصر پر قبضے کے بعد کن طریقوں سے شریعتِ اسلامی میں دخل اندازی کی اور اسے اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرنے میں کامیاب ہوئی...؟

اسلام لارڈ کرومر، (برطانوی حکمران ونوآبادیاتی اہلکار) کی نظر میں پیچھڑا اور جامد (یعنی بدلنے یا ترقی کو قبول نہ کرنے والا) تھا اور وہ اس کو ترقی کے قابل نہیں پاتا تھا، وہ مصر کے معاشرے کو اس تنگ دائرے سے آزاد کرنے کے لیے کوئی قابلِ قبول طریقہ تلاش کر رہا تھا، اس کے نزدیک وہ مؤثر ذریعہ یہ تھا کہ ان لوگوں (وہ افراد جو جدید یورپی معاشرت کے ترقیاتی نمونوں پر یقین رکھتے تھے) کے سینوں میں اجتہاد کا خیال گھول دیا جائے، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ انہی افراد کو پھر حساس دینی مناصب سونپ دیے جائیں مثلاً: صدورِ الافتاء (فتویٰ دینے کے اختیارات) مشیختِ ازہر (ازہر کے اعلیٰ عہدہ) اور ازہر کی انتظامیہ تاکہ وہ مرد جو یورپی معاشرت کے مظاہر واقدار کے ماننے والے تھے شیوخِ ازہر اور علماء کو شرائط سے بالا ہو کر اجتہاد کی طرف مائل کریں، یہاں تک کہ بات پہنچی کہ شیخ المراغی (ازہری عالم) تک جا پہنچا کہ مجتہد کے لیے ضروری

نہیں کہ وہ عربی زبان کا ماہر ہو، پھر برطانوی نمائندے (رسولِ بریٹین) شریعتِ اسلامی پر اجتہاد کرنے لگے اور ان کے ان ٹھوس کاموں کے نتیجے میں قانونِ احوالِ شخصیہ تبدیلیاں آئیں، تعددِ زوجات (شادیوں کی تعداد) اور حقِ طلاق کو محدود کیا گیا اور مرد وعورت کے درمیان میراث میں برابری لانے کی طرف قدم اٹھائے گئے،

اجتہادی فتاویٰ سر گرم ہوئیں: حجاب کا انکار ہوا، بینکوں میں مخصوص مقدار تک سود کی گنجائش تسلیم کی گئی، اور ان فتویٰ دہندگان کو وسیع النظر، لچک دارِ فکر، اور روحِ اسلام کو سمجھنے والا کہہ کر پکارا گیا۔([1])

تو اس قریبی واقعے سے ہمیں کونسی عبرت حاصل کرنی چاہیے؟ ہمارے عظیم فقہی ڈھانچے کو جو مخلص مجتہدان نے گزشتہ قرون میں محنت سے قائم کیا گیا کو کیوں گرانا چاہیے، اور سب کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھول کر چاروں مذاہب کی پیروی ترک کروادی جائے؟ اور یاد رکھو کہ وہ وبا (یہاں استعارہ: اجتہاد کا منتشر وبے ضابطہ پھیلاؤ جو شرعی بنیادوں کو متاثر کرسکتا ہے) جو ماضی میں اجتہاد کے میدان میں داخل ہوئی تھی، آج بھی اپنے اندر موجود ہے، اور آج جو ہاتھ شریعت کے احکام کو اجتہاد کی چھری سے پھاڑنے کے لیے تیار ہیں، وہ کل کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہیں۔

تو اے تقلید کے منکرو!

عامی مسلمانوں کا پیچھا چھوڑ دو کہ وہ اپنے ائمہ کی پیروی کریں جن پر صدیوں نے مشروع تقلید کی مہر ثبت کی ہے اور اگر تم واقعی اجتہاد کرنا چاہتے ہو تو (ائمہ مجتھدین کی مخالفت کے بجائے) اپنے اجتہاد کا

([1])۔الاتجاهات الوطنية فى الأدب المعاصر، ج:2 ص: 298 وما بعد؛ وكتاب موقف العقل والعلم والعالم رب العالمين، ج:4 ص:350 وما بعد

میدان ان جدید مسائل کو بناؤ جو سابق ائمہ کے دائرۂ غور میں نہ تھے، ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ آپ کو درست فکر اور صوابِ رائے عطا فرمائے۔

لیکن افسوس! آپ لوگ وہ نئے سوالات نہیں اٹھاتے جو ائمہ نے نظرِ ثانی میں نہیں رکھے یعنی وہ مسائل جن کے بارے میں عام لوگ آج روزانہ پوچھتے ہیں، مثلاً:

بیمۂ زندگی اور مال ۔ جدید مالی و اجتماعی معاہدہ۔ مختلف اقسام کی کمپنیاں (شراکتیں، سرمایہ کار کمپنیاں وغیرہ) آج کے اجتماعی ضمانتی نظام (سوشل گارنٹی/سوشل سیکیورٹی) معاہدات میں مختلف داخلی معاوضے اور زمین کے نئے نوعیت کے معاہدات جو مالک اور کرایہ دار کے مابین رائج ہیں وغیرہ۔ تم ان سب پر غور نہیں کرتے، پھر بھی چاروں ائمہ کے اجتہادات کو حقیر سمجھتے ہو اور عوام کو ان کی تقلید سے روکتے ہو!! بے شک، میں نے کبھی ان لامذہبیوں (غیر مقلدین) میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ ان روزمرہ، نئے اور اشاعت شدہ مسائل پر تحقیقی کام کریں بلکہ وہ اپنی پوری توانائی صرف اس بات میں صرف کرتے ہیں کہ جو قائم و ثابت شدہ احکام ہیں انہیں تباہ کر دیا جائے، اور یہ عمل کرنے والے نہ صرف خطا کر رہے ہیں بلکہ وہ تمام مجتہدین اور مقلدین کے سامنے اللہ کے ہاں بری الذمہ ہیں کیونکہ انہوں نے حق کا تقاضا ادا نہیں کیا۔

اے لوگو! وہ احکام چھوڑ دو جو مسلمانوں کے پاک و مخلص ائمہ نے ترتیب دیے اور جنہیں نسل در نسل قبول کیا گیا اور ہمارے لیے بازو کھولو تاکہ ہم مل کر اُن نئے اور طاری مسائل میں اجتہاد کریں جن پر سابق ائمہ نے کبھی غور نہیں کیا، اور جن کے بارے میں عوام واقعی اللہ کے حکم سے ناواقف ہیں۔ اگر تم اجتہاد سے کچھ نکال کر لاؤ اور انہیں کتاب و سنت کے دلائل سے مربوط کر دو، اور استنباط کے طریقوں کے ساتھ ان کا

ثبوت پیش کرو، تو ہم چاروں ائمہ کے اجتہادات کو تمہارے اجتہادات کے ساتھ پیش کرنے پر آمادہ ہیں اور عوام کو تمہاری پیروی کرنے دیں گے۔[1]

بعض لامذہبی افراد کے ساتھ ہونے والی علمی بحث و مناقشے کا خلاصہ

یہ باب بلاشبہ اس رسالے کے تمام ابواب سے زیادہ اہم اور غور طلب ہے، اس کی اہمیت اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی نئے علمی دلائل یا اجتہادی پیمانے بیان کیے گئے ہیں، بلکہ اس لیے کہ یہاں آپ ان لوگوں (سلفی و غیر مقلدیت) کی عصبیت، ہٹ دھرمی اور فکری جمود کے وہ مناظر دیکھو گے جو شاید کسی ذی عقل انسان سے بعید تصور ہوں، یہ حضرات ہمیں تعصب کا الزام دیتے ہیں صرف اس لیے کہ ہم اُس حق سے پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہیں جو ہزاروں دلائل سے واضح اور روشن ہے، لیکن اگر آپ ان کے طرزِ فکر کو قریب سے دیکھو تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہی لوگ خود تعصب کی زنجیروں میں اس قدر جکڑے ہوئے ہوتے ہیں یہاں تک کہ اپنے مؤقف کے دفاع میں حماقت اور جنون تک کو قبول کر لیتے ہیں! میں اس باب میں نہ کسی پر بہتان باندھ رہا ہوں، نہ کسی خیالی کہانی کا سہارا لے رہا ہوں، بلکہ میں صرف وہی واقعات نقل کر رہا ہوں جو حقیقت میں پیش آئے ہیں نہ کہ وہ جو میری اپنی گھڑت ہوں۔ میں نے اُس بھائی سے، جس سے یہ گفتگو ہوئی، جب دیکھا کہ وہ اپنے عجیب و غریب اقوال پر اصرار کر رہا ہے، تو میں نے کہا کہ:

اگر تم اسی مؤقف پر قائم رہے تو میں تمہارے یہ اقوال جوں کے توں شائع کر دوں گا۔ اور اللہ گواہ ہے، میں نے یہ بات کسی بدنیتی یا ذاتی غرض سے نہیں کہی تھی، بلکہ اصلاح کی نیت سے کہ شاید وہ اپنے کلام پر غور کرے۔

---

[1]۔ یہ کر و اور شرط یہ ہے کہ تم اس میں ماہر (اہلِ اجتہاد) ہو۔

(1)یہی ہمارا جواب ہے اُن لوگوں کے لیے جو آج یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے اپنا مؤقف بدل لیا ہے یا بات میں تبدیلی کی ہے،

اللہ کی قسم! اگر ہمیں اللہ کا خوف باز نہ رکھتا تو ہمیں اس سے روکنے کے لیے تقریباً دس افراد کی گواہی کافی تھی، جنہوں نے یہ بات اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اپنے کانوں سے سنی۔(حاشیہ ختم)

میں نے وہ بات صرف اس نیت سے کہی تھی کہ شاید وہ کچھ غور و فکر کرے، اپنے کلمات پر نظر ڈالے اور تساہل و عجلت سے باز آجائے، لیکن اُس نے بڑے اعتماد سے کہا کہ :

جو چاہو شائع کرو، مجھے کوئی خوف نہیں! میں نے اس شخص کا نام ظاہر نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے، بس اتنا سمجھ لیجئے کہ وہ اُن میں سے ہے جو لامذہبیت (یعنی غیر مقلدیت) کی تعلیم دیتے ہیں، سیکھنے والے نہیں، اور انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ ایک شریف، نیک، اور دیانت دار نوجوان ہے لیکن اس فکری آفت نے اس کے ذہن کو بگاڑ کر اسے عصبیت اور فکری مغالطے کے گہرے غار میں دھکیل دیا ہے۔ وہ کچھ نیک نیت نوجوانوں کے ساتھ میرے پاس آیا جو حق کی تلاش میں مخلصانہ کوشش کر رہے تھے۔

میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اس سے کہا کہ :

آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کے احکامات کو سمجھنے کا کیا طریقہ ہے؟ کیا آپ براہِ راست قرآن و سنت سے احکام اخذ کرتے ہو؟ یا مجتہد ائمہ کے اقوال سے رہنمائی لیتے ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ :

میں ائمہ کے اقوال اور ان کے دلائل کو دیکھتا ہوں، پھر جو بات قرآن و سنت کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے اسی کو اختیار کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ:

فرض کرو آپ پاس پانچ ہزار لیرے (شامی کرنسی) ہیں جو چھ ماہ سے آپ کے پاس جمع ہیں، پھر آپ نے ان پیسوں سے سامانِ تجارت خریدا اور کاروبار شروع کیا، اب بتائیں: زکوٰۃ کب ادا کروگے؟ مزید چھ ماہ بعد یا ایک پورا سال مکمل ہونے کے بعد؟

وہ کچھ دیر تک تو خاموش رہا پھر سوچتے ہوئے بولا کہ:

تمہارے اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ تجارتی مال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے!

میں نے کہا کہ : میں تو سوال کر رہا ہوں اور میرا مطلوب یہ ہے کہ آپ اپنے مخصوص طرزِ فکر سے اس کا جواب دیں، یہ رہی آپ کے سامنے پوری لائبریری تفسیر، حدیث اور ائمہ مجتہدین کی کتب سبھی موجود ہیں،

وہ شخص کچھ دیر خاموش ہو کر غور کرنے لگا، پھر بولا:

بھائی! یہ دین کا معاملہ ہے، کوئی معمولی بات نہیں کہ یوں ہی فوری رائے دے دی جائے، اس کے لیے غور و فکر، مطالعہ اور نظرِ ثانی ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ وقت چاہتا ہے، جبکہ ہم تو یہاں کسی اور موضوع پر بحث کرنے آئے ہیں۔

میں نے اس سوال سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہا کہ:

اچھا آپ تو یہ بتائیں کہ کیا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ خود ائمہ کے دلائل کا مطالعہ کرے اور پھر ان میں سے وہی رائے اختیار کرے جو کتاب و سنت سے زیادہ قریب ہو۔ اس نے جواب دیا: جی ہاں، لازم ہے۔ میں نے کہا کہ:

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمام لوگ وہی علمی صلاحیت رکھتے ہیں جو ائمہ مجتہدین کو حاصل تھی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ! کیونکہ جو شخص ائمہ کے اقوال پر حکم لگانے یا ان کے اقوال کو کتاب وسنت کے معیار پر پرکھنے کی اہلیت رکھتا ہے وہ تو یقینی طور پر ان سب سے زیادہ عالم ہوا! وہ بولا کہ :

حقیقت یہ ہے کہ لوگ تین طبقوں میں منقسم ہیں:

مقلد، متبع، اور مجتہد۔ جو شخص مختلف مذاہب کا تقابل کر کے اس رائے کو اختیار کرتا ہے جو کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہو تو ایسا شخص متبع کہلاتا ہے، اور یہ درجہ، تقلید واجتہاد کے درمیان ایک درمیانی درجہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ :

تو پھر مقلد پر کیا واجب ہے ؟اس نے جواب میں کہا کہ : مقلد جس مجتہد کی چاہے تقلید کرے۔

میں نے کہا:

کیا اس پر کوئی گناہ یا حرج ہے اگر وہ ایک ہی امام کی تقلید پر قائم رہے اور بار بار کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو ؟اس نے جواب دیا کہ :

جی ہاں، یہ اس کے لیے حرام ہے۔ میں نے کہا کہ : اس حرمت پر دلیل کیا ہے ؟

اس نے کہا کہ : دلیل یہ ہے کہ اس مقلد نے اپنے آپ پر ایک ایسی چیز لازم کر لی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس پر لازم نہیں کیا۔ میں نے پوچھا کہ :

آپ قرآن کریم کس قراءت سے پڑھتے ہیں ؟ کہا: قراءتِ حفص سے۔ میں نے کہا: کیا آپ اس قراءت کے التزام پر قائم ہیں یا ہر روز ایک نئی قرات اختیار کر لیتے ہیں ؟ کہا: نہیں میں تو اسی قرات پر قائم ہوں۔ میں نے کہا کہ : پھر آپ اس پر کیوں قائم ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر صرف یہ لازم کیا ہے کہ آپ قرآن

کو ویسے ہی پڑھیں جیسے وہ نبی ﷺ سے متواتر طور پر منقول ہے؟ کہا: اس لیے کہ مجھے دوسری قراتوں کا علم حاصل نہیں نہ ہی مجھے ان کی تعلیم کا موقع ملا لہٰذا میں اسی پر قائم ہوں جس کا مجھے علم ہے۔ میں نے کہا کہ:

تو پھر جو شخص فقہ کی تعلیم امام شافعی کے مذہب پر حاصل کرے وہ بھی اسی طرح ہے، اسے بھی دوسرے مذاہب کا علم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا اور اس نے اپنے دینی احکام کا فہم صرف اسی امام کے ذریعہ حاصل کیا ہے، اگر تم اس پر لازم قرار دو کہ وہ تمام ائمہ کے اجتہادات سیکھے اور ان سب کے دلائل پر نظر کرے، تو پھر تم پر بھی لازم ہو گا کہ۔ تمام قرائتیں سیکھو اور ان سب سے قرآن پڑھو،

اور اگر تم اپنے لیے عذر پیش کرو کہ تم میں یہ طاقت نہیں، تو لازم ہے کہ اسی عذر کو اس مقلد کے لیے بھی قبول کرو، پھر یہ بھی سوچو کہ تمہیں کس بنیاد پر یہ خیال آیا کہ مقلد پر لازم ہے کہ وہ ایک مذہب سے دوسرے میں مسلسل منتقل ہوتا رہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نہ تو اسے کسی خاص مذہب پر ہمیشہ رہنے کا حکم دیا ہے اور نہ ہی ہر دم اس کے تبدیل کرنے کا؟ وہ بولا کہ:

حرام تو اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی امام کی پیروی کو اس طرح اپنے اوپر لازم سمجھنے لگے کہ اللہ نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ میں نے کہا:

یہ تو بالکل صحیح بات ہے، اس پر کسی کو اختلاف نہیں، لیکن اگر کوئی شخص کسی خاص امام کی اتباع اس نیت سے کرے کہ اللہ نے اس پر یہ لازم نہیں کیا بلکہ سہولت اور اطمینان کے لیے وہ اسی امام کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے تو کیا اس میں کوئی حرج ہے؟ اس نے کہا: نہیں، اس میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے کہا کہ:

لیکن جس رسالے کو تم پڑھ رہے ہو اس میں تو اس کے برعکس بات لکھی ہے، بلکہ بعض مقامات پر تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو شخص ایک امام کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہتا ہے اور اس سے نہیں ہٹتا، م وہ کافر ہے۔

وہ چونک کر بولا: کہاں؟

پھر اس نے رسالہ اٹھایا اس کے صفحات پلٹنے لگا اور عبارات پر غور کرتے ہوئے بولا کہ: صاحبِ رسالہ نے یہاں یہ لکھا ہے کہ :

جو شخص ہر مسئلے میں ایک ہی امام کے ساتھ التزام رکھے وہ متعصب، خطاکار اور اندھا مقلد ہے، اور ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور گروہوں میں بٹ گئے۔ در حقیقت اس کی مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ اس پر شرعاً ایسا کرنا واجب ہے تو یہی مذموم ہے، عبارت میں کچھ اختصار اور کمی رہ گئی ہے۔ میں نے کہا:

آپ کو یہ یقین کس دلیل سے ہے کہ مصنف کی مراد یہی تھی؟ اور آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ شاید مصنف سے ہی غلطی ہو گئی ہو؟ لیکن وہ شخص اپنے مؤقف پر اڑا رہا، اور بضد تھا کہ عبارت بالکل درست ہے، بس اس میں ایک محذوف تقدیر ہے اور مصنف اپنی اس تحریر میں کسی قسم کی خطا سے پاک ہے گویا وہ معصوم ہو! میں نے کہا:

مگر اس تقدیر کے اعتبار سے بھی عبارت اپنے مخالف کے لیے کوئی مؤثر جواب نہیں رکھتی اور نہ ہی اس میں کوئی فائدہ باقی رہتا ہے، کیونکہ یہ بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ کسی خاص امام کی اتباع شرعاً فرض نہیں، اور جو شخص کسی ایک امام کے مذہب پر قائم رہتا ہے وہ یہ کسی زبردستی یا وجوب کے اعتقاد سے نہیں بلکہ اپنی سہولت، اعتماد اور اطمینانِ قلب کے باعث کرتا ہے۔ وہ بولا:

یہ کیسے ممکن ہے؟

میں نے تو کئی عام لوگوں بلکہ بعض اہلِ علم سے بھی یہ سنا ہے کہ کسی ایک مذہب پر شرعاً قائم رہنا واجب ہے، اور یہ کہ دوسرے مذہب کی طرف منتقل ہونا جائز نہیں! میں نے کہا:

اچھا تو مجھے ان میں سے کسی ایک کا نام تو بتایئے، چاہے عوام میں سے ہو یا علماء میں سے، جس نے آپ سے ایسا کہا ہو؟ وہ خاموش ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے چہرے پر تعجب کے آثار نمایاں تھے، گویا وہ میرے اس جواب سے حیران ہو کہ واقعی شاید میرا کہنا درست ہو۔ پھر وہ مسلسل یہ دہراتا رہا کہ میرے نزدیک تو بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مذاہب کی تبدیلی کو حرام سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا:

آج کے دور میں تمہیں ایک بھی ایسا شخص نہیں ملے گا جو اس باطل وہم کو سچ مانتا ہو، ہاں، بعض عثمانی ادوار کے آخر میں یہ بات منقول ہے کہ وہ لوگ حنفی مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب میں جانے کو ناپسند کرتے تھے اگر یہ روایت درست ہے، تو یقیناً وہ طرزِ فکر انتہائی گراہوا اور اندھی فرقہ وارانہ تعصب کی بدترین مثال تھی۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ:

یہ جو تم مقلد اور متبع کے درمیان فرق بیان کرتے ہو، یہ فرق لغوی ہے یا اصطلاحی؟

اس نے جواب دیا کہ : یہ فرق لغوی ہے۔ میں نے لغت کی مستند کتب اس کے سامنے رکھ دیں تاکہ وہ ان سے مقلد اور متبع کے مابین کوئی لغوی فرق ثابت کرے۔ مگر اسے ان میں سے کوئی ایسی شہادت نہ مل سکی۔ پھر میں نے کہا کہ:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک اعرابی سے فرمایا تھا جو مسلمانوں کے کسی فیصلے پر اعتراض کر رہا تھا کہ:

اگر مہاجرین راضی ہیں تو تم لوگ ان کے تابع ہو۔ اس جملے میں "تبع" کا لفظ محض اتباع اور اتفاق کے معنی میں آیا ہے نہ کہ کسی رائے رکھنے یا غور و بحث کے حق کے معنی میں۔ یہی مفہوم قرآنِ کریم کی اس آیت میں بھی موجود ہے: (إِذۡ تَبَرَّأَ ٱلَّذِينَ ٱتُّبِعُوا۟ مِنَ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوا۟)

جہاں تبعیت کو اندھی تقلید اور شرکِ فکری کی ایک پست ترین صورت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ وہ بولا: اچھا تو مان لیتے ہیں کہ یہ فرق اصطلاحی ہے، آخر کیا میں اپنی اصطلاح قائم نہیں کر سکتا؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، اصطلاح قائم کرنے کا حق تو تمہیں حاصل ہے، لیکن تمہاری یہ خود ساختہ اصطلاح حقیقتِ امر کو نہیں بدل سکتی، جسے تم متبع کہہ رہے ہو وہ یا تو دلائل اور استنباط کے طریقوں سے بخوبی واقف ہے، تو وہ در حقیقت مجتہد ہے، اور اگر وہ ان دلائل و اصول سے ناواقف ہے یا ان سے حکم اخذ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تو وہ محض مقلد ہے۔ اور اگر کوئی شخص کچھ مسائل میں اس درجے کا علم رکھتا ہو اور کچھ میں نہ رکھتا ہو، تو وہ بہر حال ان میں مقلد اور ان میں مجتہد قرار پائے گا، چنانچہ تقسیم بہر صورت دو ہی حیثیتوں پر قائم رہے گی، اور ہر درجے کا حکم واضح اور متعین ہے۔ وہ بولا:

میرا مطلب یہ ہے کہ متبع وہ ہوتا ہے جو مختلف اقوال اور ان کے دلائل میں تمیز کر کے کسی ایک کو ترجیح دیتا ہے، اور یہ درجہ محض تقلید سے مختلف ہے۔ میں نے کہا:

اگر تمہارے نزدیک اقوال میں تمیز کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے دلائل کی قوت و ضعف کو پہچان سکے، تو یہ در اصل اجتہاد کی اعلیٰ ترین منزل ہے، کیا تم خود اس درجہ کے اہل ہو؟ وہ بولا:

میں اپنی استطاعت کے مطابق ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے کہا:

مجھے معلوم ہے کہ تمہارا فتویٰ یہ ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کا لفظ صرف ایک طلاق شمار ہوتا ہے، تو کیا تم نے اپنی اس رائے میں ائمہ کے اقوال اور دلائل کا تقابل کیا، پھر ان میں تمیز کر کے اس نتیجے پر پہنچے ہو؟ یاد کرو !

حضرت عُوَیمِر العجلانیؓ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا، پھر کہا: اللہؐ کے رسول صلی اللہؐ علیہ وسلم ! اگر میں نے اس پر جھوٹ بولا ہے تو میں اسے تین طلاق دیتا ہوں ! اب بتاؤ، تمہیں

اس حدیث کا علم ہے؟ اور کیا تم جانتے ہو کہ اس کا استدلال اس مسئلے میں جمہور کے مذہب کے موافق ہے یا ابن تیمیہ (1) کے؟۔اس نے کہا:

مجھے اس حدیث کا علم نہیں۔ میں نے کہا:

تو پھر تم نے ایسے نازک مسئلے میں فتویٰ کیسے دے دیا جس میں چاروں ائمہ کے مذاہب متفق ہیں، اور تم نے نہ اُن کے دلائل کا مطالعہ کیا نہ اُن کی قوت و کمزوری کو پرکھا؟ یوں تو تم نے خود اپنے اس اصول کو توڑ دیا جسے تم نے اپنا شعار بنایا ہے اور دوسروں پر لازم کرنا چاہتے ہو، یعنی اتباع کا وہ مفہوم جسے تم نے اپنی اصطلاح میں وضع کیا ہے!

اس نے کہا: اُس وقت میرے پاس اتنی کتابیں موجود نہ تھیں جن سے میں ائمہ کے مذاہب اور اُن کے دلائل کا مطالعہ کر سکتا۔

میں نے کہا: پھر ایسی حالت میں تمہیں کس چیز نے فتویٰ دینے پر آمادہ کیا؟

تم نے مسلمانوں کے اجماعی موقف کے خلاف رائے قائم کر لی، جبکہ تم نے خود تسلیم کیا کہ تم نے ان کے دلائل تک رسائی حاصل نہیں کی! وہ بولا:

میں نے صرف اس لیے فتویٰ دیا کہ مجھ سے سوال کیا گیا، اور میرے پاس محدود کتب کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ میں نے کہا:

---

(1)۔ یہ حدیث ان صریح اور صحیح دلائل میں سے ایک ہے جو واضح طور پر بتاتی ہے کہ تین طلاقیں ایک ہی لفظ میں دی جائیں تو تین ہی واقع ہوتی ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی دلائل کے لیے میرے مجموعے "محاضرات فی الفقہ المقارن" کی طرف رجوع کرو۔

تو تمہارے لیے وہی راستہ کھلا تھا جو تمام ائمہ اور علماء نے اپنایا کہ اگر مسئلہ واضح نہ ہو تو کہا جائے :

مجھے علم نہیں یا کم از کم تم چاروں مذاہب کے اقوال کے ساتھ مخالفین کی رائے بھی نقل کر دیتے، مگر بغیر کسی ترجیح کے، خود سے فتویٰ نہ دیتے۔ یہی تمہارا فریضہ تھا، خصوصاً جب مسئلہ تمہاری اپنی ذات سے متعلق بھی نہ تھا کہ تم کسی اضطرار کے باعث کسی ایک رائے کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتے۔ مگر تم نے اجماعِ ائمہ اربعہ کے برخلاف محض اپنے دل کے اطمینان پر ایک ایسے قول کو اختیار کر لیا جس کے دلائل تم نے کبھی دیکھے ہی نہیں! کیا یہی نہیں وہ تعصب جس کا الزام تم ہم پر لگاتے ہو؟

وہ بولا: میں نے ائمہ اربعہ کے اقوال شوکانی، سبل السلام اور سید سابق کی فقہ السنہ میں دیکھے ہیں۔

میں نے کہا:

یہ وہ کتابیں ہیں جن کے مؤلفین اس مسئلے میں ائمہ اربعہ کے مخالف ہیں، اور ظاہر ہے کہ وہ اپنی بات ہی کے حق میں دلائل ذکر کرتے ہیں۔ تو کیا تم یہ پسند کرو گے کہ کسی مقدمے کا جج صرف ایک فریق اور اُس کے گواہوں کی بات سن کر فیصلہ صادر کر دے؟

وہ بولا: مجھے اپنے اس طرزِ عمل میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔

مجھ سے سوال کیا گیا اور جتنی سمجھ و مواد میرے پاس تھا میں نے اسی کے مطابق فتویٰ دیا۔

میں نے کہا: لیکن تم خود کہتے ہو کہ تم متبع ہو اور تمہارا موقف یہ ہے کہ ہر مسلمان کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے، یعنی تمام مذاہب کے اقوال و دلائل کا تقابل کرے اور جو کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہو اُسے اختیار کرے، لیکن تم نے اپنے اس اصول کو خود ہی پامال کر دیا! تم جانتے ہو کہ چاروں مذاہب کا اجماع ہے کہ تین طلاقیں ایک ساتھ دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ اُن کے پاس اس پر مستند

دلائل موجود ہیں، مگر تم نے اُن پر کبھی نظر نہیں ڈالی بلکہ اُن کے اجماع کو چھوڑ کر ایک ایسی رائے کو اپنا لیا جو تمہارے ذوق اور طبیعت کو موافق آتی ہے۔ کیا تمہیں پہلے سے یقین تھا کہ ائمہ اربعہ کے دلائل باطل ہیں؟

وہ بولا:

نہیں، لیکن میں اُن کے دلائل سے واقف نہ تھا کیونکہ میرے پاس اُن کا کوئی ماخذ موجود نہیں تھا۔ میں نے کہا:

تو پھر تم نے انتظار کیوں نہ کیا؟ کس نے تمہیں اتنی جلدی فتویٰ دینے پر مجبور کیا؟ کیا تمہارے اوپر اللہ نے ایسا کوئی فریضہ عائد کیا تھا؟

کیا تمہارا ائمہ کے دلائل سے ناواقف ہونا ابن تیمیہؒ کے موقف کی قوت کی دلیل بن گیا؟ کیا یہی وہ تعصب نہیں جس کا جھوٹا الزام تم اہلِ تقلید پر لگاتے ہو؟

وہ بولا:

میں نے جو کتب میرے پاس تھیں، اُن میں کچھ ایسے دلائل دیکھے جو مجھے قائل کر گئے اور اللہ نے مجھ پر اس سے زیادہ کا بوجھ نہیں ڈالا۔ میں نے کہا:

اگر کوئی مسلمان کسی کتاب میں کوئی دلیل دیکھ لے جو بظاہر کسی رائے کے موافق ہو، تو کیا یہی کافی ہے کہ وہ ان دلائل کی بنیاد پر اُن تمام ائمہ کے مخالف ہو جائے جنھوں نے اس کے برخلاف اجماع کیا ہے، اور جن کے دلائل کو اس نے خود کبھی پڑھا بھی نہیں؟

وہ بولا: ہاں، میرے نزدیک یہی کافی ہے۔ میں نے کہا:

فرض کرو ایک نیا نوجوان جسے دینی علم کی کوئی خاص تربیت حاصل نہیں، قرآن کی یہ آیت پڑھتا ہے: وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ:115)

اور وہ اس سے یہ سمجھتا ہے کہ نماز میں کسی خاص سمت کا پابند ہونا ضروری نہیں، کیونکہ آیت کے ظاہر الفاظ سے یہی مفہوم نکلتا ہے۔ پھر اسے علم ہوتا ہے کہ چاروں ائمہ اس پر متفق ہیں کہ: نماز میں قبلہ رُخ ہونا فرض ہے، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اُن کے پاس اس کی شرعی دلیل موجود ہے، مگر وہ اُن دلائل کو دیکھ نہیں پایا۔ اب بتاؤ، جب وہ نماز کے لیے کھڑا ہو تو کیا اپنی سمجھ کے مطابق کسی بھی سمت منہ کر کے نماز پڑھ لے؟ یا پھر ان ائمہ کی پیروی کرے جن کا اس پر اجماع ہے؟

وہ بولا: نہیں، بلکہ اپنی فہم کے مطابق عمل کرے۔

میں نے کہا:

یعنی وہ مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے اور تم اس کی نماز کو صحیح مانو گے؟

اس نے کہا: جی ہاں، انسان اپنی ذاتی قناعت کی پیروی کرنے کا مکلف ہے۔

میں نے کہا: اچھا، تو فرض کرو اگر اس کی یہی قناعت اسے یہ یقین دلا دے کہ اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرنا کوئی گناہ نہیں، یا شراب نوشی میں کوئی قباحت نہیں، یا لوگوں کے مال پر ناحق قبضہ کرنا اس کے نزدیک جائز ہے، تو کیا محض اس کی اس ذاتی قناعت کی بنا پر اللہ تعالیٰ ان تمام افعال کو اس کے لیے حلال قرار دے دیں گے؟

یہ سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہا،

پھر بولا:

یہ صورت جو تم نے بیان کی ہے محض ایک خیالی مثال ہے، ایسا کبھی حقیقت میں نہیں ہوتا۔

میں نے کہا:

نہیں، یہ خیالی نہیں، بلکہ ایسی اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مثالیں کثرت سے پیش آتی ہیں، کتنے ہی نوجوان ایسے ہیں جنہیں اسلام، اس کی کتاب اور اس کی سنت کا کچھ بھی علم نہیں، اور وہ اتفاقاً یہ آیت پڑھ لیتے ہیں:

﴿وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾ (یعنی مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، پس تم جدھر بھی رخ کرو وہیں اللہ کی ذات ہے۔)

اب وہ آیت کے ظاہر سے یہی مفہوم اخذ کرتا ہے کہ نماز میں کسی مخصوص سمت کی پابندی ضروری نہیں، بلکہ ہر شخص جس طرف چاہے رخ کر سکتا ہے، حالانکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ تمام مسلمان کعبہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

تو کیا تم اسے ایک خیالی مثال کہو گے؟

نہیں، یہ ایک عین ممکن الوقوع اور بارہا پیش آنے والی صورت ہے، جب تک امت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دین کے بنیادی احکام سے بھی بے خبر ہیں۔ اور بہر حال، خواہ تم اسے فرضی مثال کہو یا حقیقی تم نے اس کے بارے میں جو حکم دیا وہ تو ہر گز فرضی نہیں تھا؛

تم نے کہا کہ :

ہر حال میں ذاتی قناعت ہی کو معیار بنانا چاہیے" حالانکہ یہی بات تمہارے اپنے تقسیم کردہ اصول (مقلد، متبع، اور مجتہد) سے سراسر متصادم ہے۔

اس نے کہا: تو اسے چاہیے کہ تحقیق کرے، کیا اس نے کوئی اور آیت یا حدیث نہیں پڑھی؟

میں نے کہا: نہیں، اسے تحقیق کے وسائل میسر نہیں، بالکل اسی طرح جیسے تمہیں میسر نہیں تھے جب تم نے طلاق کے مسئلے میں فتویٰ دیا تھا، اسے بھی وہی ایک آیت دستیاب ہوئی جس سے اس نے قبلہ کے بارے میں یہ سمجھا، تو کیا اب بھی تم یہی کہو گے کہ وہ اپنی ذاتی قناعت کے مطابق چلے اور ائمہ کے اجماع کو چھوڑ دے؟

اس نے کہا: جی ہاں، اگر وہ مزید تحقیق پر قادر نہیں تو معذور ہے، اور بس اتنا کافی ہے کہ وہ اپنی فہم پر اعتماد کرے جہاں تک اس سے کوشش ہو سکی!

میں نے کہا: میں تمہارے اسی قول کو نشر کروں گا، کیونکہ یہ ایک نہایت خطرناک بات ہے!

اس نے کہا: جو چاہو نشر کرو، میں کسی سے نہیں ڈرتا۔

میں نے کہا: تم مجھ سے نہیں، خدا سے تو ڈرو! تمہارے اس قول نے تو گویا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو پسِ پشت ڈال دیا: (فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ [النحل: 7) اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھو۔

اس نے کہا: بھائی! یہ ائمہ معصوم نہیں، میں تو اسی آیت کو مانتا ہوں جو اللہ نے نازل کی، پھر میں معصوم کے کلام کو چھوڑ کر غیر معصوموں کی آراء کا پابند کیوں بنوں؟

میں نے کہا: اے نادان! وہ معصوم تو اس مفہوم میں ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں مراد لیا، نہ کہ وہ مطلب جو اس جاہل نوجوان نے اپنی ناقص عقل سے سمجھا۔

میں تم سے دو چیزوں کی بات کر رہا ہوں:

ایک اُس نوجوان کا فہم، اور دوسرا ائمہ مجتہدین کا فہم۔ دونوں ہی غیر معصوم ہیں، مگر ایک سراپا جہل اور سطحیت میں غرق، جبکہ دوسرا علم، تدبر اور گہرائی میں ممتاز!

اس نے کہا: اللہ کسی انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مکلف نہیں بناتا۔

میں نے کہا: ذاچھا، تو پھر اس مثال کا جواب دو:

ایک شخص کا بچہ بیمار ہے، شہر کے تمام ماہر طبیبوں نے معائنہ کیا اور متفقہ طور پر کہا کہ اسے فلاں دوا دینی چاہیے اور خبر دار کیا کہ اگر اسے پینسلن کا ٹیکہ لگا دیا تو وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیکن باپ نے کسی طبّی رسالے میں پڑھا کہ پینسلن سوزش کے علاج میں مفید ہے، چنانچہ وہ اپنی ذاتی قناعت پر بھروسہ کرتے ہوئے ڈاکٹروں کی رائے کو نظرانداز کرتا ہے اور اپنے بچے کو پینسلن کا ٹیکہ لگا دیتا ہے جس کے نتیجے میں بچہ دم توڑ دیتا ہے۔ اب بتاؤ، کیا وہ باپ مجرم اور گناہگار نہ ٹھہرے گا؟

وہ کچھ دیر سوچتا رہا: پھر بولا: یہ مثال اس معاملے سے مختلف ہے۔

میں نے کہا: نہیں، بلکہ یہ تو عین وہی معاملہ ہے! اس نے بھی تمام ڈاکٹروں کے اجماع کو سنا مگر اپنی ذاتی فہم پر عمل کیا، جیسے اُس نے تمام ائمہ کے اجماع کو سنا مگر اپنی قناعتِ ذاتی کو ترجیح دی۔ اس نے طبّی کتاب سے ایک بات پڑھی اور اس پر عمل کر کے اپنے بچے کو ہلاک کیا، اسی طرح اُس نے قرآن کی ایک آیت پڑھی اور ظاہری مطلب لے کر امت کے اجماع کو چھوڑ دیا۔ دونوں نے ہی اپنی ذاتی قناعت کو فیصلہ کن مانا۔

اس نے کہا: بھائی! قرآن تو نور ہے، کیا نور کی دلالت بھی عام کلام کی دلالت جیسی ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا:

کیا قرآنِ مجید کا نور ہر دیکھنے والے اور پڑھنے والے کے عقل و شعور میں یکساں طور پر منعکس ہو جاتا ہے ؟اور کیا وہ سب اس نور کو ویسا ہی سمجھ لیتے ہیں جیسا اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے ؟اگر ایسا ہے تو پھر اہلِ ذکر اور عام لوگوں میں فرق ہی کیا باقی رہ گیا؟ جبکہ دونوں بظاہر ایک ہی سر چشمۂ نور سے فیضیاب ہو رہے ہیں ! پس مثال دونوں کی یکساں ٹھہری ان میں کوئی فرق نہیں رہا۔

لیکن اب تم مجھ کو صاف جواب دو:

کیا ایسے دونوں معاملوں میں فیصلہ کرنے والا اپنی ذاتی رائے پر چلتا ہے یا پھر اُسے ماہرین و اہلِ اختصاص کی پیروی اور تقلید کرنی چاہیے ؟اس نے کہا:

بلکہ ذاتی رائے اور ذاتی قناعت ہی اصل ہے۔

میں نے کہا:

چلو، اگر یہی اصول ہے، تو جب کسی نے اپنی ذاتی قناعت کے بل پر علاج کیا اور نتیجتاً ایک بچہ مر گیا تو کیا اب اُس پر شرعاً یا قانوناً کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہو گی؟ وہ شخص بڑے اعتماد سے بولا:

نہیں، اس پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں !

میں نے کہا: بس، یہی تمہارا آخری جواب ہے تو پھر گفتگو کو یہی پر ختم کرتے ہیں، کیونکہ تمہاری یہ ایک بات، بحث و فہم کی ہر راہ بند کر دیتی ہے۔ اب میرے اور تمہارے درمیان کسی مشترک بنیاد پر کوئی علمی گفتگو باقی نہیں رہتی۔

اور سن لو! تمہارا یہ جواب، ملتِ اسلامیہ کے اجماعی موقف سے بالکل انحراف ہے، خدا کی قسم ! اگر دنیا میں "تعصبِ مذموم" نام کی کوئی چیز ہے تو وہ تمہارے ہی طرزِ فکر کا دوسرا نام ہے ! جہالت میں ڈوبا

ہوا ایک مسلمان، جب قرآن سے اپنی ذاتی سمجھ بوجھ استعمال کرتا ہے اور قناعتِ نفس کی بنیاد پر نماز پڑھتا ہے مگر قبلہ سے منہ پھیر لیتا ہے تو کیا اس کی نماز درست ہو گی؟

اگر تمہاری منطق مانی جائے تو ہاں، کیونکہ وہ بھی اپنی رائے پر قائم ہے!

اسی طرح ایک عام آدمی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے، اپنی ذاتی قناعت کے زور پر علاج معالجہ کرتا ہے، جسے چاہے دوا دیتا ہے، جس طرح چاہے علاج کرتا ہے، اور اگر مریض اُس کے ہاتھوں مر جائے، تو لوگ اسے تسلی دیتے ہیں کہ:

اللہ تمہیں جزائے خیر دے، تم نے نیک نیت سے کوشش کی! اب میں سوچتا ہوں آخر یہ لوگ ہمیں کیوں نہیں چھوڑ دیتے کہ ہم بھی اپنی ذاتی قناعت پر عمل کر سکیں؟ ہم بھی تو اسی بنیاد پر یہ قناعت رکھتے ہیں کہ جو شخص دین کے احکام اور ان کے دلائل سے ناواقف ہے، اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ ائمہِ مجتہدین میں سے کسی ایک امام کے مسلک کو اختیار کرے، کیونکہ وہ اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت کو اُس سے کہیں بہتر جانتے ہیں۔ اور اگر ان کے نزدیک ہمارا یہ نظریہ غلط ہے،

تو پھر اس غلطی کو بھی ان کی اپنی اصطلاح میں قناعتِ ذاتیہ کی شفاعت حاصل ہونی چاہیے! چنانچہ ہماری تقلید بھی اُن کے نزدیک اسی طرح درست قرار پائے، جس طرح قبلہ سے منہ موڑ کر نماز پڑھنے والے کی نماز درست ہے، اور جس طرح ایک بچے کا مارا جانا اُن کے نزدیک اجتہاد اور علاج کے نام پر قابلِ معافی سمجھا جاتا ہے۔

اور اب بعد از کلامِ گزشتہ

اے میرے عزیز و منصف قارئینِ گرامی! اگر آپ واقعتاً حق کے متلاشیوں میں سے ہیں، اگر آپ کا دل اندھی تقلید اور موروثی تعصب کی زنجیروں سے آزاد ہے، اور آپ کا مقصد صرف یہ ہے کہ دلیل

کے ساتھ حق کو پہچان لیں، تو جان لو کہ میں نے اس رسالے میں جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے لیے ایک روشن پیغام ہے، ایسا پیغام جو ہر دُھند کو چھانٹ دیتا ہے اور ہر اُلجھن کو سُلجھا دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ کاوشِ حق کے لیے نہیں، بلکہ کسی ایسی فکر یا نظریے کے دفاع کے لیے گفتگو کر رہے ہیں، جو اب آپ کے وجود کا جزو بن چکی ہے، جس کے ساتھ آپ کی پہچان جڑ چکی ہے، اور جس کے بغیر آپ اپنے آپ کو نامکمل سمجھتے ہیں

تو پھر سن لیجئے: اگر میں آپ کے سامنے حق کے پہاڑ جتنے دلائل بھی رکھ دوں، اور صداقت کے دریا بہا دوں، تب بھی ان سے آپ کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوگا، کیونکہ پھر آپ کی بیماری جہالت نہیں، بلکہ وہ تعصب ہے جسے علم نہیں مٹا سکتا، اور ایسی بیماری کا علاج صرف علم سے نہیں بلکہ اس ربّ کے حضور اخلاص و مراقبے سے ممکن ہے جو دلوں کے رازوں کو جانتا ہے، اگر آپ اپنے دل کو سچائی کے ساتھ اُس کے سامنے جھکا دیں تو وہی ذات آپ کو بصیرت عطا فرمائے گی، اور آپ کی عقل کے آئینے سے تعصب کی گرد کو صاف فرما دے گی، اور یاد رکھئیے! ہر جماعت یا تحریک جو کسی دعوت یا مسلک کو لے کر اُٹھتی ہے، اس کے درمیان کچھ ایسے لوگ ضرور گھس آتے ہیں جن کا اس دعوت کے ایمان یا انکار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ جب لوگوں کے دل قریب آنے لگیں، جب محبت اور فہم و تدبر کی فضا جنم لینے لگے، تو وہ دوبارہ نفرت کی آگ بھڑکا دیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جو بظاہر کسی نظریے کے سب سے بڑے حمایتی بنتے ہیں لیکن ان کا باطن فساد سے بھرا ہوتا ہے، ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اتفاق کو اختلاف میں، اختلاف کو عداوت میں، اور بحث کو دشمنی میں بدل دیں، یہ کوئی فرضی بات نہیں بلکہ ایک عینی حقیقت ہے جسے ہر صاحبِ عقل محسوس کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ:

ہم اس فتنہ انگیزی اور فکری انتشار سے کیسے بچیں؟

علمی اختلافات کو دشمنی اور تفرقے میں بدلنے سے روکنے کا راستہ کیا ہے؟

اس کا جواب صرف ایک ہے:

کہ ہم تحقیق میں انصاف اور گفت وشنید میں اخلاص کو معیار بنائیں، ہم اپنے فیصلے صرف صاف، روشن، غیر جانب دار علمی دلائل پر قائم کریں اور اپنے دلوں کو ہر تعصب، ہر گروہی مفاد اور ہر خود پسندی سے پاک رکھیں۔ جب ایسا ہوگا تو اختلاف، دشمنی نہیں رہے گا بلکہ علم کا سبب بنے گا، دل قریب آئیں گے، اور بات واضح تر ہوگی، تب کوئی سازشی، کوئی فتنہ انگیز ہم میں تفرقہ نہیں ڈال سکے گا، نہ ہمیں دشمنی اور بدگمانی کی کھائی میں دھکیل سکے گا۔ میں نے اس رسالے میں وہ تمام دلائل پیش کر دیے ہیں جن کی روشنی میں ایک عاقل انسان حق تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے، آپ نے خود دیکھا کہ رسالے کے مصنف (منکر تقلید خجندی) نے بعض ایسی باتیں نقل کیں جو سراسر حقیقت کے برعکس تھیں، اور وہ اقوال جنہیں اُس نے اپنی تائید میں پیش کیا، خود انہی علماء کی زبان سے ان کی صریح تردید ثابت ہوگئی۔ اور آپ یہ بات واضح ہوگئی کہ،

عہدِ صحابہ سے آج تک جمہورِ مسلمین کا اجماعی موقف (تقلید) کے بارے میں کیا رہا ہے، اور یقیناً آپ نے میری گفتگو کو غور وتدبر سے پڑھا ہوگا، اللہ کریم کی ذاتِ بابرکت گواہ ہے:

کوئی منصف شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اپنی بحث میں کجی دکھائی یا دلائل میں خیانت کی یا پھر تحقیق کے راستے سے ذرہ برابر بھی انحراف کیا۔

لہٰذا اے میرے محترم قارئین!

اب لوٹ آؤ اس سیدھی، روشن اور متوازن راہ کی طرف جس پر ہر دور کے اکابر، ائمہ اور جمہورِ امت گامزن رہے ہیں، اسی راہ کے مددگار بنو، اس کے دفاع میں کھڑے ہو، اور اس کے دونوں کناروں پر پائے جانے والے افراط اور تفریط دونوں سے لوگوں کو بچاؤ، اپنے مخاطبین کو سمجھاؤ کہ تعصب اور اندھی تقلید

دین نہیں بلکہ دلیل، فہم، اور بصیرت دین کی بنیاد ہیں، مگر وہ دلیل جو سمجھ میں آئے اور وہ فہم جو صحیح علم پر قائم ہو۔

اور اے بھائیوں! خبر دار رہو، کہ کہیں آپ خود غلو اور انتہا پسندی کی راہ اختیار نہ کر بیٹھو، کیونکہ یہی غلو ہر فتنے، ہر گمراہی اور ہر مصیبت کی جڑ ہے۔

اور آخر میں یاد رکھو کہ :

نہ طاقت کسی انسان کے پاس ہے، نہ ہدایت کا اختیار کسی کے قبضے میں، تمام قوت، تمام توفیق، اور ہر خیر کا سرچشمہ صرف اور صرف اللہ ربّ العزت ہے۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

ردِّ مخالفین کا علمی محاکمہ

جب میں نے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری مکمل کی اور طباعت کے تمام مراحل طے کر لیے، تو اسی دوران میرے ہاتھ ایک کتاب پہنچی، جس کا نام: "المذهبية المتعصبة هي البدعة" ہے، اور یہ کتاب سید محمد عید عباسی کی جانب منسوب ہے،

یہ دراصل میری اسی تصنیف پر مخالفین (سلفی و غیر مقلدین) کی طرف سے ردّ کے طور پر لکھی گئی ہے، میں نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا اور ناشر کو ہدایت دی کہ وہ میری اس کتاب کی طباعت میں کچھ توقف کرے، کیونکہ مجھے امید تھی کہ شاید اس ردّ میں کوئی علمی فائدہ یا نکتہ ہو جو مجھ سے نظر انداز ہو گیا ہو مل جائے تاکہ میں اپنی لکھی ہوئی اس کتاب میں اصلاح یا وضاحت کر سکوں، یا پھر ممکن ہے کہ اس ردّ میں کوئی علمی اشتباہ موجود ہو جس پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہو، تاکہ میں اپنی اس تحقیقی کتاب کو ایک نئے زاویے سے پیش کر سکوں جو شبہات و ابہامات کو دور کر دے، مگر جب میں نے اس ردّ کا مطالعہ کیا جو تین سو پچاس صفحات پر مشتمل تھا، تو مجھے اس میں کوئی ایسی بات نہ ملی جو میری کتاب پر میرے لیے نظرِ ثانی کو لازم کر دے، اس لیے میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ مخالفین کی طرف سے لکھی گئی کتاب کے مباحث پر الگ سے جواب لکھنے کے بجائے، اپنی اسی کتاب کے آخر میں مختصراً اس ملحقہ کا اضافہ ہی کافی ہو گا، کتاب کے مباحث پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے یہ علمی مباحث نہیں بلکہ طنز و دشنام کے شعلے ہوں، ہر صفحے پر گالی، طعن و تشنیع، اور بد زبان حملے دہک رہے ہیں،

میں نے اپنی علمی زندگی میں کسی بھی محقق یا مخالف کا ایسا شدید اور متعصب انداز نہیں دیکھا، چاہے وہ سطحی ہو یا کسی بھی حد تک متعصب ہو،

مخالفین کا طرزِ خطاب

حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ کتاب علمی دنیا میں زیادہ معروف نہیں، لیکن پھر بھی میں اخلاص کے ساتھ قارئین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو خود سے تلاش کریں اور آخر تک صبر و حوصلے کے ساتھ مکمل پڑھیں۔ کیونکہ علمی بحث کے بجائے ان کی اس قسم کی گفتگو دراصل ان لوگوں کی اصلی پہچان اور فکری سطح کو بے نقاب کرتی ہیں، اور قاری کو یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ ان کے طرزِ گفتار اور کردار سے عوام کو خبردار کرنا کیوں ضروری ہے، اب ان کے گالیوں اور الزام تراشیوں کے انبار کے بعد، مجھے اپنے دفاع میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ تو خیر القرون کے عظیم ائمہ کو بھی اپنی زبانِ دراز کا نشانہ بناتے رہے، اللہ تعالیٰ ان سب پر راضی ہو اور ان کے علوم سے ہمیں نفع دے،

مثلاً:

ان کے نزدیک امام غزالیؒ دین سے خارج تھے،

امام باجوریؒ ان کے خیال میں احمق تھے،

اور امامِ اعظم ابو حنیفہؒ کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ بس چند احادیث کے حافظ تھے، اس کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے،

بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شیخ محمد الحامدؒ (اللہ ان پر رحمت کرے) گویا مجوسیت کے راستے پر چل رہے تھے اور ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا! (نعوذ باللہ من ذٰلک) اور ان کے نزدیک، ان کے سوا جو بھی نوجوان علم و دین کی بات کرے وہ سب مسلوب العقل و احمق ہیں، جیسا کہ ان کے بڑے طعنہ زن نے خود لکھا

ہے ۔([1])۔ تو کیا یہ قدرتی بات نہیں کہ میں بھی ان کی گالیوں اور طعنوں کا کئی گنا زیادہ نشانہ بنوں؟ حالانکہ میں تو ان اکابر میں سے کسی ایک کے جوتے کا خادم بننے کے بھی لائق نہیں۔

کتاب کے آغاز پر اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہونا۔

میں اس بات پر حیران نہیں ہوا کہ اس کتاب کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کا نام شامل نہیں تھا، کیونکہ یہ کتاب اپنی فطرت اور معیار کے مطابق شائع ہوئی، اور مصنفین کے دل میں رسول ﷺ کی سنت کی قدر و منزلت (یعنی سنت نبوی ﷺ کی پیروی اور تعظیم) کو ظاہر کرتی ہے، اور یہ بتاتی ہے کہ کتاب صرف اپنی محدود فکری روش اور تعصب کی عکاس ہے۔ خیر میں اگلے چند صفحات میں (اس کتاب کے متعلق) اپنے مختصر علمی تبصرہ جات پیش کروں گا، لیکن (اُس کتاب کے) اُن تمام بیانات کو نظر انداز کروں گا جو ہر شریف انسان کے لیے ناپسندیدہ یا غیر علمی ہوتے ہیں، یہ فیصلہ میں اس نصیحت کی روشنی میں کر رہا ہوں، جو مجھے چند دن پہلے ایک معروف اسلامی شخصیت نے کی، جب میں چند عربی ممالک کے دورے پر تھا۔

انہوں نے کہا کہ:

خبردار! یہ لوگ تمہیں اپنی سطح پر جدل و مباحثہ (یعنی دلیل یا بحث میں غیر ضروری جھگڑا) میں نہ کھینچیں، کیونکہ ان کے دلوں میں عام مسلمانوں، سلف صالح اور خلفاء کے خلاف اتنا حسد و عناد موجود ہے کہ وہ ہر مخالف کو نشانہ بنانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ اگر میں اُس کتاب میں موجود اُن تمام غلطیوں، الزامات اور نازیبا گفتگو کو بیان کرنا شروع کروں تو تو میں خود کو علمی سطح گرا دیتا، اور ایک طویل وقت کی ضیاع میں پڑ جاتا، جو اصل مقصد یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے علمی کام سے ہٹ کر صرف تشفی، جھگڑا اور مباحثہ بن جاتا، اور ہر شریف

([1])۔ مراد ہے محمود مہدی الاستانبولی۔

انسان کو ایسے بیہودہ کھیل سے پرہیز ہی کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ بات ضروری نہ ہوتی کہ عام مسلمانوں کو ان لوگوں کی حقیقت اور رویہ سے آگاہ کرنا ضروری ہو، تاکہ وہ ان کے فریب اور جھوٹے دعووں (یعنی ان کی غلط بیانی اور علمی دھوکہ) میں نہ آئیں، تو میں اس کتاب پر ایک حرف بھی لکھنے کی زحمت نہ کرتا، لیکن علمی دیانت اور اسلامی فریضے کے تقاضے کے تحت، میں چند ایسے نکات بیان کرنے پر مجبور ہوں، جو قاری کو ان افراد کی حقیقت اور علمی سطح سے آگاہ کریں، اور ان کے رویہ کی پھرتیاں و تعصب کو واضح کریں۔

کتاب کے مؤلفین اور تصنیف کی حقیقت

کتاب کے سرورق پر لکھا ہے: "بقلم محمد عید عباسی" مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ان کی قلم سے مکمل طور پر نہیں لکھی گئی، بلکہ اس کی تیاری میں جیسا کہ ہمیں یقین ہے نہ کہ محض قیاس شیخ ناصر البانی، محمود مہدی الاستنبولی اور خیر الدین انلی شریک تھے، اور سید محمد عید عباسی نے صرف چند محدود تحقیقات میں تعاون کیا، یہ خود محمود مہدی الاستنبولی نے اپنے دوست حاج عدنان طبیا کو ایک نجی نشست میں بتائی، جب وہ کتاب کی تیاری میں مصروف تھے۔ یہاں مؤلفین سے ایک اہم شرعی سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ:

آیا ایک مسلمان کا اپنا قول کسی اور کے نام منسوب کرنا کیسا عمل ہے؟ ایسے شخص کو کیا کہا جائے گا؟ کیا اس جھوٹ میں کوئی شرعی بہانہ یا جائز دلیل شامل ہو سکتی ہے یا نہیں؟

میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ امام شافعیؒ نے کوئی کلام لکھا اور پھر اسے کسی اور کے نام منسوب کر دیا، یا کسی اور کا کلام لے کر اسے اپنے نام سے منسوب کر لیا، تو اس پر سے میرے دل کا اعتبار ختم ہو جائے گا، میں اسے کسی بھی حکم کے منتقل، حدیث کے راوی یا کسی مسئلے میں اجتہاد کرنے کے لائق امین نہیں سمجھوں گا۔ تو پھر کیا کیا جائے جب یہی عمل شیخ ناصر اور محمود مہدی کرتے ہیں؟

مصنفین کا مجھ پر الزام اور اسکی حقیقت

مصنفین نے مجھ پر دعویٰ کیا کہ میں نے رسالہ "ھل المسلم ملزم باتباع مذھب معین" کے مصنف یعنی شیخ المعصومی کی موجودگی سے انکار کیا اور کہا کہ "ایک سلفی نے اسے لکھا اور اپنا نام لوگوں سے چھپائے رکھا" میں آپ کے سامنے اپنی کتاب اللامذھبیۃ" کے وہی الفاظ پیش کرتا ہوں جو میں نے کہے:

ایک شخص نے اشاعت کی، اور چاہا کہ اپنا نام نہ لکھے اور نہ ہی اپنی ذات کا کوئی اظہار کرے، اس نے ایک کتابچہ شائع کیا جس کا نام رکھا: کیا مسلمان کسی مخصوص مکتبِ فکر پر عمل کرنے کا پابند ہے؟

اور اس کی تالیف کو محمد سلطان المعصومی الخجندی کی طرف منسوب کیا۔(دیکھئے: اللامذھبیہ: صفحہ 24)

ملاحظہ کیجئے میں نے تو اس شخص کو کتاب کا ناشر قرار دیا، نہ کہ مصنف اور یہ نسبت درست اور ناقابلِ انکار بھی ہے، کیونکہ ناشرِ کتاب نے یہی کیا تھا۔ تو پھر ان مصنفین نے میرا وہ قول کیوں بدل کر میری طرف منسوب کیا جو میں نے کہا ہی نہیں؟ اور کیا وجہ تھی کہ انہوں نے میرے لفظ "نشرھا" کی جگہ "کتبھا" لکھ دیا، جب کہ ان دونوں کے معنی میں بڑا فرق ہے، بتاؤ تو آخر ان مصنفین کی اس لفظی تبدیلی کو کیا نام دیا جائے اور اس کا حکم کیا ہوگا؟

حوالہ امامِ غزالی بر شروطِ اجتہاد

مصنفین نے عنوان : ہمارا موقف مذاہب کے بارے میں اور اجتہاد و تقلید کے بارے میں ہماری رائے " کے تحت (صفحہ 13) پر صحتِ اجتہاد کی شرائط پیش کی ہیں، جن کا حوالہ انہوں نے امام غزالیؒ کے المستصفیٰ سے لیا ہے۔امام غزالیؒ کا اس باب میں فرمان یہ ہے کہ:

اجتہاد کی دوسری شرط، جو بنیادی شرط ہے، یہ ہے کہ مجتہد شرعی دلائل کا احاطہ رکھتا ہو اور ان میں غور و فکر کر کے ظنِ غالب پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ صلاحیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ ان دلائل کو جانتا ہو جو احکام کے استخراج کا ذریعہ بنتے ہیں، اور استخراج کے طریقے کو بھی پہچانتا ہو، اور یہ تمام باتیں آٹھ علوم کے علم سے حاصل ہوتی ہیں، جو یہ ہیں: کتاب، سنت، اجماع، عقل، قیاس، اصولِ فقہ، لغت و نحو، ناسخ و منسوخ اور اصطلاحاتِ حدیث۔

المعصومی کا موقف اور استدلال

پھر مصنف نے امام غزالیؒ کے اسی قول سے استدلال کیا ہے تا کہ المعصومی کے اس قول کی صحت ثابت ہو جو اس نے اپنے رسالے میں کہا کہ:

اور اس طریقے کا حاصل کرنا آسان ہے، اس کے لیے موطّأ، صحیحین، سننِ ابی داود، جامعِ الترمذی اور نسائی سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں، یہ کتابیں معروف و مشہور ہیں، تھوڑے وقت میں حاصل کی جا سکتی ہیں، لہذا تمھیں ان کا علم حاصل کرنا چاہیے، اور اگر تم خود نہ جان سکو اور تمہارے کچھ بھائی تم سے پہلے اس علم کو حاصل کر لیں، اور تمھیں تمہاری اپنی زبان میں سمجھا دیں، تو اس کے بعد تمہارے پاس کوئی عذر باقی نہیں

قولِ غزالیؒ اور مصنفین کی تضاد بیانی

امام غزالیؒ نے اجتہادِ مطلق کے لیے آٹھ علوم میں مہارت کو شرط قرار دیا ہے، جبکہ المعصومی نے اس کے بر خلاف کہا کہ صرف وہ حدیث کی مشہور کتابیں بازار سے حاصل کر لی جائیں کیونکہ یہ مشہور اور آسانی سے دستیاب ہیں۔ پھر شیخ ناصر نے المعصومی کے کلام کی صحت کے لیے امام غزالیؒ کے بیان سے نہ صرف استدلال کیا، بلکہ انہوں نے میرے متعلق مزید کہا کہ:

اور اسی سے تم ڈاکٹر بوطی کی غلطی جان سکتے ہو، جب اس نے المعصومی کے قول پر طنز کیا کہ اجتہاد آسان اور ممکن ہے...وغیرہ۔

میں حیرت کرتا ہوں اس بات پر کہ کوئی کسی چیز کی صحت پر اس کے ضد یا نقیض سے استدلال کرے!

الزام اور حقیقت:

اسی عنوان کے تحت مصنف نے یہ بھی انکار کیا کہ ان کی طرف یہ نسبت لگائی جاتی ہے کہ وہ اجتہاد کو ہر شخص پر واجب قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی کہ وہ جاہل پر تقلید کو حرام کہتے ہیں (ص 15)۔

میں عرض کرتا ہوں کہ:

حقیقت یہ ہے کہ شیخ ناصر اور بعض ان کے ساتھی بعض اوقات اور بعض مجالس میں ایسے بیانات دیتے ہیں، مگر حقیقتِ حال جو ہر اس شخص کو معلوم ہے جو ان کے زیرِ اثر آیا، وہ یہ ہے کہ وہ کسی ایسے فرد کو نہیں چھوڑتے جس پر ان کا اثر ہو، یہاں تک کہ وہ اس کے دل سے چاروں اماموں کے اعتماد کو نکال دیں اور اسے یہ محسوس کرائیں کہ وہ بھی ان ائمہ کی مانند سمجھ سکتا ہے اور اجتہاد کر سکتا ہے، پھر اسے اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ کسی بھی شرعی حکم کو قبول نہ کرے جب تک وہ اس کی دلیل کتاب و سنت سے طلب نہ کر لے۔

عوام، مجتہد اور ان کے مقلدین

ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ ان کے بعض پیروکار، بالخصوص عوام اور جاہل لوگ، مساجد اور راستوں میں ائمہ و علماء پر اعتراض کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ شافعیؒ اور ابو حنیفہؒ کے اجتہادات پر بھی ان سے مناظرات

کرتے ہیں، اور بضد رہتے ہیں کہ وہ ان ائمہ کی تقلید نہ کریں بلکہ ان کی بنیاد صرف کتاب وسنت ہے۔ اگر آپ ان میں سے کسی کو کہیں کہ قرآن کی محض تین آیات پڑھ دیں، تو آپ ان سے لحن وادائیگی کی بے شمار غلطیاں سنیں گے ! یہ لوگ کسی مارِ باقی دنیا کے نہیں ہیں، جیسا کہ ہم نے متعدد جگہوں پر کہا بلکہ ایسے کثیر لوگ ہیں کہ کوئی محلہ، بستی یا مسجد ان کے شر سے خالی نہیں، اور سب ان کے دکھاوے کے علم اور بے بنیاد اجتہاد سے متاثر ہیں۔

مجتہد، مقلد اور متبع کی درجہ بندی

خیر صفحہ 33 پر مصنف نے اعتراض کیا کہ ہم نے لوگوں کو صرف دو طبقات میں تقسیم کیا :

مجتہد اور مقلد، اور درمیانی درجہ متبع کو مدِ نظر نہیں رکھا۔ حالانکہ ہم نے واضح کیا تھا کہ متبع کا انجام دو صورتوں میں سے ایک ہے:

اگر وہ شعبہ دلائل میں مہارت نہ پاسکے تو وہ مقلد بنتا ہے، اور اگر وہ اس مہارت کو حاصل کر لے تو وہ مجتہد بن جاتا ہے۔ مصنف نے ہمارے موقف کی تردید کے لیے الشاطبیؒ کی کتاب الاعتصام سے ایک عبارت بھی نقل کی۔ اے قارئینِ گرامی !

میں چاہتا ہوں کہ آپ غور کریں کہ یہ لوگ کس طرح نقل میں تحریف اور جھوٹ کرتے ہیں، اور ائمہ کی طرف ایسے اقوال منسوب کر دیتے ہیں جو انہوں نے کبھی ادا نہیں کیے، تو غور کرو خوب غور کرو تاکہ تم اچھی طرح سمجھ سکو ان لوگوں کی حقیقت اور ان کے دلوں میں جو کچھ پوشیدہ ہے۔

امامِ شاطبیؒ کی عبارت اور تحریف کی ایک نئی مثال

مخالفین نے امام شاطبیؒ کی عبارت اس طرح پیش کی کہ :

مکلف (شرعی احکام کا پابند) احکامِ شریعت میں تین حالتوں سے خالی نہیں ہوتا:

پہلی یہ کہ وہ مجتہد ہو، تو اس کے لیے وہی حکم معتبر ہوگا جو اس کے اجتہاد سے ظاہر ہوا، دوسری یہ کہ وہ سراسر مقلد ہو، علمِ حاکم سے کلی طور پر خالی، تو اس کے لیے ایک رہنما ضروری ہے جو اسے راہ دکھائے، تیسری یہ کہ وہ اگرچہ مجتہد کے درجے تک نہ پہنچا ہو مگر دلیل اور اس کے محل کو سمجھتا ہو، اور اس کی فہم اتنی مضبوط ہو کہ وہ ترجیح کے معتبر اصولوں کے ذریعے مناطِ حکم کو پہچان سکے۔ (الاعتصام، ج3، ص350)

یہاں مصنفین نے شاطبیؒ کے کلام کو اسی مقام پر ختم کر کے قوس بند کر دیا، اور آگے کا حصہ جان بوجھ کر حذف کر دیا۔

آیئے اب ہم اصل ماخذ کی طرف رجوع کرتے ہیں، یعنی کتاب الاعتصام (ج 3، صفحہ 253، مطبع المنار)، جہاں وہی کلام پورا موجود ہے، اور دیکھتے ہیں کہ مصنف نے کون سا حصہ "امانت داری" سے چھپا لیا۔

شاطبیؒ وہاں فرماتے ہیں کہ:

پس یہ شخص یا تو ایسا ہوگا کہ اس کی ترجیح و نظر کو معتبر مانا جائے، اگر ہم اسے معتبر مان لیں تو وہ اس پہلو سے مجتہد کے مانند ہے، اور مجتہد دراصل علمِ حاکم کا پیروکار ہوتا ہے، لہٰذا جو اس کے مشابہ ہو وہ بھی اسی درجے میں ہے، اور اگر ہم اس کی رائے کو معتبر نہ مانیں تو وہ لازماً عامی کے درجہ میں لوٹ آئے گا، اور عامی بھی دراصل مجتہد کی اتباع اسی بنا پر کرتا ہے کہ وہ علمِ حاکم کی طرف متوجہ ہوتا ہے، پس جو اس کے مرتبے میں اتر آئے وہ اسی حکم میں ہے۔

تحریف کا نتیجہ اور مجھ پر طنز

تو اب بتائیں! شاطبیؒ کے نزدیک "متبع" کا انجام کیا ہے؟ جیسا کہ آپ نے خود پڑھ لیا:

یا تو وہ مجتہد کے ساتھ شمار ہو گا اگر وہ اس کی درجہ کو پہنچ جائے، یا اگر اس کی طاقت اس سے کم ہو تو وہ عامی کے زمرے میں داخل ہو گا۔ یوں تقسیم پھر وہی دو حصوں میں لوٹ آئی اور یہی وہ بات ہے جو ہم پہلے سے کہہ رہے تھے۔ مگر مصنفِ "امین" نے شاطبیؒ کے کلام کے اسی حصے کو کاٹ پھینکا، یعنی وہ حصہ جو ان کی دعویٰ کے خلاف گواہ تھا، تاکہ عبارت ایسے نظر آئے گویا شاطبیؒ ان کے مؤقف کے حامی ہیں! پھر وہ اسی کٹی پھٹی عبارت سے استدلال بھی کرتے ہیں، اور مجھ پر تعجب کرتے ہیں کہ میں نے "نص" کو پڑھا مگر "سمجھا نہیں" اور کہتے ہیں کہ میں "بکواس" کر رہا ہوں اور "بے سمجھی میں ہانک رہا ہوں!!"

اب ذرا سوچو میرے بھائی! کوئی مسلمان ایسے شخص پر کیسے اعتماد کرے جو نقول میں خیانت کرے، اور کلام کو اس کے اصل محل سے ہٹا دے جیسا کہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو؟ پھر لوگ اس سے احکامِ شریعت اخذ کرنے پر کیسے مطمئن ہوں؟ اور اسے ائمہ کی آراء اور اجتہادات کی تخفیف و تحقیر کا حق کیسے دیں؟ میں تو ہر اس شخص سے کہتا ہوں جس کے پاس کتاب الاعتصام (شاطبیؒ) موجود ہو کہ وہ جلد سوم، صفحہ 253 (مطبعة المنار) کو کھولے، خود مطالعہ کرے، غور کرے، اور ان اہلِ تحریف کی چالوں سے عبرت حاصل کرے، تاکہ وہ اپنے دین کے معاملے میں بصیرت پر قائم رہے۔

تقلید اور عقائد میں ناصر البانی کی انوکھی رائے

میں پہلے وضاحت کر چکا ہوں کہ جمہور امتِ مسلمہ کے نزدیک تقلید اپنی شرائط کے ساتھ صرف فروعی احکام میں جائز ہے، یعنی وہ احکام جو ظنی دلائل پر مبنی ہیں، لیکن جہاں عقائد یا وہ احکام ہوں جو قطعی دلائل پر قائم ہیں، ان میں تقلید کی کوئی گنجائش نہیں۔ چونکہ فروعی احکام کا اکثر حصہ ظنی دلائل پر قائم ہے، اس لیے

ان میں اجتہاد ایک فطری اور ضروری امر ہے۔ مگر شیخ ناصر نے، اپنی اس مشترکہ تصنیف میں جسے انہوں نے سید محمود مہدی اور خیر الدین وانلی کے ساتھ مل کر لکھا، یہ دعویٰ کیا کہ میں نے دو بڑی غلطیاں کیں:

ایک یہ کہ تقلید کے باب میں عقیدہ اور شریعت کے درمیان فرق کیا، اور دوسری یہ کہ میں لکھا کہ فروعی احکام کی اکثر بنیاد ظنی دلائل پر ہے۔ ان کے نزدیک عقیدۂ یقینی اور اجتہادی احکام دونوں کو ظنی دلائل جیسے احادیثِ آحاد پر قائم کرنا درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ورنہ نبی ﷺ نے کس طرح ایک ایک شخص کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو عقائد کے امور سکھائے؟ (صفحہ 45، سطرِ اوّل)

میں کہتا ہوں:

شیخ ناصر کی جتنی بھی انفرادی آرا میں نے دیکھی ہیں، ان میں سے کوئی رائے اس قدر عجیب اور غیر معقول نہیں لگی،

مجھے یقین تھا کہ وہ میری کئی باتوں سے اختلاف کریں گے، مگر یہ کبھی گمان نہ تھا کہ وہ ایسی قطعی علمی حقیقت سے بھی انکار کریں گے جس پر قدیم و جدید تمام ائمہ اور علماء کا اجماع ہے سوائے ایک شخص کے، اور وہ ہے عبید اللہ ابن الحسن العنبری، جو معتزلہ میں سے تھا۔

دلائل ظنی و قطعی کی بحث

یہ حقیقت ہر لحاظ سے علمی اور قطعی ہے کہ:

سب سے پہلے عقل کے ابتدائی شواہد اس کی تصدیق کرتے ہیں اور بعد میں صحابہ کرام کے عملی رویے سے بھی یہ واضح ہو جاتی ہے جیسا کہ یہ حقیقت عنقریب واضح ہو گی۔

عقلی دلیل کا مطلب یہ ہے کہ عقلاء متفق ہیں:

اگر کوئی نتیجہ صرف ظنی مقدمات سے حاصل کیا جائے تو وہ صرف ظنِ غالب پیدا کرے گا، قطعی یقین نہیں، قطعی حقیقت صرف قطعی مقدمات اور قطعی دلائل سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

مثلاً: اگر ایک ڈاکٹر کو معلوم ہے کہ کسی خاص زہر کا ایک پیالہ پینے سے آدھے گھنٹے میں موت واقع ہو جائے گی، تو وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ پینے والا آدھے گھنٹے میں فوت ہو جائے گا، لیکن اگر اس کے پاس صرف شواہد کی ظنی معلومات ہوں، تو وہ صرف اندازہ لگا سکتا ہے، یقین نہیں۔ یہ بات ہر عقلمند کے لیے ناقابلِ بحث ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

ظنی دلائل جیسے احادیثِ آحاد اکیلے اصول اعتقادیہ کے لیے کافی نہیں، کیونکہ اللہ نے ہمیں ان میں قطعی یقین رکھنے کا حکم دیا ہے، علماء کا اتفاق ہے کہ:

ظنی دلائل پر مبنی مسائل، جیسے قیامت کے دن جسموں کی دوبارہ تشکیل کی تفصیل، قطعی دلائل کے بغیر قطعی یقین کے لیے قابلِ اعتماد نہیں، لہٰذا کسی ایک احتمال پر قطعی یقین کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے اور اس پر یعنی کسی ایک حقیقت پر اعتقاد لازمی نہیں۔

شیخ ناصر کا دعویٰ اور اس کا عقلی رد

اگر یہ بات واضح اور منطقی ہے، تو پھر شیخ ناصر کیسے سمجھتے ہیں کہ قطعی یقین صرف ظنی دلائل جیسے احادیثِ آحاد سے حاصل ہو سکتا ہے؟ شیخ ناصر مثال دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ایک صحابی نے لوگوں کو عقائد کے بنیادی اصول سکھائے جیسے وہ فروعی احکام سکھاتے ہیں:

اس کا جواب، جیسا کہ امام غزالیؒ اور دیگر علماء نے بتایا، یہ ہے کہ:

صحابہ اس وقت تک عقائد نہیں سکھا سکتے تھے جب تک کہ لوگ رسول اللہﷺ کی صداقت پر یقین نہ کر لیتے، اگر لوگ پہلے صداقت پر یقین نہ کریں تو صحابہ انہیں کیسے تعلیم دے سکتے؟

چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ:

اصل رسالت، ایمان اور نبوت کی اطلاع احادیثِ آحاد پر قائم نہیں ہو سکتی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کس طرح کہیں گے :

'آپ کو مجھ پر یقین کرنا لازم ہے' جبکہ لوگ ابھی میری رسالت پر ایمان نہیں لائے؟ مزید یہ کہ، جو شخص کسی ظنی خبر کے ذریعے اللہ پر ایمان لاتا ہے، اس کا ایمان صرف اس خبر پر نہیں بلکہ عقلی دلائل کے مجموعے پر قائم ہوتا ہے، جو یقین پیدا کرتے ہیں، خبر تو محض ایک اشارہ یا رہنمائی کے طور پر کام کرتی ہے،

جیسا کہ علامہ الایجی نے "المواقف" میں بیان کیا ہے کہ۔

عقل مند کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ صرف ظنی خبر پر قطعی عقیدہ قائم کرے، خاص طور پر جب اس نے خود معاملے کو نہ دیکھا، نہ محسوس کیا، اور نہ کسی یقینی دلیل تک رسائی حاصل کی ہو۔

لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ:

وہ اصول اعتقادی جن پر اللہ تعالیٰ نے قطعی یقین کرنے کا حکم دیا، وہ ظنی دلائل جیسے احادیثِ آحاد پر قائم نہیں ہو سکتے، بلکہ ان کے لیے قطعی مقدمات جیسے متواتر خبر یا قطعی عقلی دلائل ضروری ہیں۔

شیخ ناصر نے جو دلائل پیش کیے، وہ ہمارے مؤقف کے مخالف نہیں اور نہ ہی وہ اجماعِ علماء کے خلاف ہیں۔

تقلید اور اجتہاد کا مقام

لہٰذا تقلید صرف اس وقت جائز ہے جب کوئی شخص اجتہاد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور اجتہاد صرف ظنی اور ممکنہ امور میں ممکن ہے، جبکہ دین کے بنیادی اصول، جن پر قطعی یقین فرض ہے، وہ ظنی نہیں۔ اسی لیے بنیادی اصول میں اجتہاد یا تقلید کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا: کسی کو بنیادی اصولِ اعتقادی میں تقلید پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اجتہاد وہاں ناممکن اور بلاجواز ہے، اور یہ سب چیزیں عقل اور دلیل کے مطابق واضح ہیں۔

دلائل قطعیہ کی اہمیت

لیکن یہاں اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ ایسے قطعی اور ضروری دلائل پر توجہ دے جو عقل کے لیے بالکل بدیہی ہوں، یعنی وہ دلائل جو نہ صرف وہ خود سمجھ سکے بلکہ دیگر عقلاء و مکلف افراد بھی ان کو سمجھ سکیں اور ان سے درست رہنمائی حاصل کر سکیں۔

اسی لیے علماء نے کہا کہ:

اگر کوئی کہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا کیونکہ میں نے اپنے والدین یا استاد کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے دیکھا، تو اس کا ایمان قابل قبول نہیں، اور اسے ایمان سمجھا نہیں جائے گا یا کم از کم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص تقلید میں ایسے اصول عقائد پر ایمان لاتا ہے، وہ گناہگار ہے، اور اگر تحقیق و تالیف کی کمیٹی پہلی بار اس بات کو سنے، یا اسے بہت عجیب لگے یا اسے لگے کہ یہ بات شیخ ناصر کی تحقیق، خیال یا منصوبہ کے خلاف ہے، تو میری تجویز یہ ہے کہ شیخ ناصر کو چاہیے کہ وہ پہلے تمام متعلقہ علماء اور سلف کی کتب کا مطالعہ کرے،

مثال کے طور پر:

امام شافعیؒ کی کتاب الرسالۃ کو ابتدا سے انتہا تک پڑھے،

امام غزالیؒ کی المستصفیٰ میں خبر اور اجتہاد کے باب کو پڑھے،

الامدیؒ کی کتاب الِاحکام یا الشاطبیؒ کی الموافقات کو پڑھے،

یا ان کے علاوہ کوئی اور وسیع و معتبر کتاب عقائد پر، آرام و صبر کے ساتھ مطالعہ کرے، ہاں دورانِ مطالعہ (البانی کو) کوئی عبارت یا مسئلہ سمجھ نہ آئے تو متکلمین (علمِ عقائد کے ماہر علماء) سے سوال کرے، اس میں کوئی عیب یا شرم کی بات نہیں، کیونکہ یہ بالکل آسان نہیں کہ کوئی شخص کسی اہم اور پیچیدہ علمی مسئلے پر، کہے کہ :

"میری رائے ہے کہ یہ استدلال یا دلیل غلط ہے "

اس سے پہلے کہ وہ مکمل مطالعہ کرے اور تمام علماء و محققین کی کتب کو سمجھے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ شیخ (ناصر البانی) میری اس نصیحت کو قبول فرمائیں، چاہے یہ کسی نادان کی طرف سے آئی ہو جس کے لیے لکھنا اور کتابت کرنا شاید مناسب نہ تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنی حکمت ایسی زبان سے بھی بلوا دیتے ہیں جو علم میں کمزور ہو،

کردار و اقوال کا فرق

بہر حال پھر مصنف نے کہا کہ ہم ائمہ چارہ (ائمہ اربعہ) کو بہت احترام اور عظمت کے ساتھ دیکھتے ہیں، ہم اور ہمارے ساتھی (البانی، خجندی و دیگر منکرینِ تقلید) ان کے فضل اور محنت کو جانتے اور قدر کرتے ہیں، کتاب و سنت کی پیروی میں ان کے آثار و اقوال کی تقلید کرتے ہیں وغیرہ۔

میں (مصنفِ بوطی) کہتا ہوں کہ :

یہ باتیں کہنے کی حد تک تو اچھی ہیں لیکن حقیقت میں ان کی کوئی ٹھوس دلیل یا عملی ثبوت موجود نہیں، تمہارا یہ دعویٰ اگر درست ہوتا تو ہم کبھی بھی (البانی کے) بڑے شاگردوں و پیروکاروں کو آئمہ کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کرتے نہ دیکھتے، اگر یہ دعویٰ سچا ہوتا تو (منکرینِ تقلید) کے مؤلفین میں سے ایک مؤلف نے یہ نہ لکھا ہوتا کہ "ابو حنیفہؒ کو صرف چند احادیث حفظ تھیں" اور اگر یہ دعویٰ درست ہوتا تو شیخ ناصر کی طرف سے مختصر صحیح مسلم للمنذری پر کیے گئے تبصرے میں یہ خطرناک بات نہ لکھی جاتی کہ:

یہ واضح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ہماری شریعت یعنی کتاب و سنت کے مطابق فیصلے کریں گے، نہ کہ انجیل یا فقہ حنفی کے مطابق۔ البانی کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ فقہ حنفی اور انجیل میں فرق نہیں، بلکہ دونوں ں شریعت اسلامی کے علاوہ کچھ اور ہیں۔ یہ سب باتیں کتاب و سنت کے مفہوم سے مختلف ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے اس لغو اور غیر مناسب بیان کی معافی مانگتا ہوں، جو کسی مسلمان کے لیے قابل قبول نہیں، ہم نے (منکرینِ تقلید) ان باتوں کو (بطور حوالہ) اس کتاب میں مزید کچھ مقامات پر اور بھی ذکر کیا ہے (دیکھئے: صفحہ ۹۱)

(البانی وغیرہ) کے ان تمام بیانات کے بعد پھر ہم کیسے یقین کریں کہ وہ سچ کہتے ہیں کہ وہ اور ان کے ساتھی ائمہ چارہ کی پیروی کتاب و سنت کے مطابق کرتے ہیں، جبکہ وہ خود واضح طور پر کہہ رہے ہیں کہ فقہ حنفی کتاب و سنت سے مختلف ہے، بالکل انجیل کی طرح ہے؟

پھر مصنف لوگوں کو یہ بھی دعوت دیتا ہے کہ وہ مذاہب کو متحد کرنے کی کوشش کریں، پھر اس کام کے لیے تدابیر و منصوبے پیش کرتا ہے، ایسا سوچ کر کہ یہ کام بہت آسان ہے، جیسے بکھری ہوئی صفحات یا الگ الگ لکڑی کے ٹکڑوں کو جمع کرنا، یہ عجیب بات ہے کہ وہ (البانی خجندی وغیرہ) مذاہب کے اتحاد کی بات بھی کرتے ہیں، اور لوگوں کو مسلسل اجتہاد کی طرف بھی دعوت دیتے ہیں، ہم ان کے لیے وہی بات کہتے ہیں

جسے ہم اور ہمارے علماء بار بار دہرا چکے ہیں جو ایک واضح اور معروف حقیقت ہے جس پر کوئی بحث یا اختلاف ممکن نہیں۔

دائرہِ بحث واختلافِ اجتہادات

اور وہ یہ ہے کہ: ہم کہتے ہیں جو احکام چاروں ائمہ کے درمیان مشترک ہیں، ان میں تو بحث کی کوئی ضرورت ہی نہیں کیونکہ سب کا ان پر اتفاق ہے، البتہ صرف وہ احکام جن میں ائمہ کے اجتہادات مختلف ہیں، بحث و تحقیق کا مرکز ہیں، کئی وجوہات کی بنا پر یہ تحقیق چونکہ عموماً ظنی اور ممکنہ دلائل پر مبنی ہوتی ہے، اور صرف وہ لوگ ہی ان کی پیچیدگی اور معنوں کو سمجھ سکتے ہیں جو اصولِ فقہ میں مہارت رکھتے ہوں، اسی لیے ہر شخص کی رائے ان احکام کے استنباط میں مختلف ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ دلائل فطری طور پر ظنی اور مختلف الرائے ہوتے ہیں۔

لیکن شیخ ناصر کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ چاروں مذاہب کو صرف چند مخصوص مسائل (مثلاً دس یا اس کے قریب) کے تناظر میں دیکھتے ہیں اسی وجہ سے وہ ائمہ اربعہ و علماء پر غیر ضروری جذبات اور غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن ہم بار بار کہتے ہیں کہ چاروں مذاہب میں صرف یہ چند مسائل ہی نہیں، بلکہ ان میں معاملاتِ مالیہ جیسے بیع، کرایہ، سود، رھن، شفعہ، شراکت، اور ذاتی معاملات جیسے نکاح، طلاق، رضاع، حضانت، وصیت، نفقات، جرائم، حدود، جہاد، باغی وغیرہ کے مسائل بھی شامل ہیں۔ میری درخواست ہے کہ وہ پہلے ان تمام مسائل کو چاروں مذاہب کے مطابق فقہ کی بڑی کتب میں مطالعہ کرے، اور پھر اپنی رائے ہمارے سامنے پیش کرے۔ پھر اگر (البانی) کے لیے ممکن ہو تو کہے کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ چاروں مذاہب کو یکجا کریں۔

مذاہب اربعہ پر تجرباتی مطالعہ

مثال کے طور پر، وہ (البانی) مطالعہ کرے کہ سود کی چھ اقسام کی وجہ کیا ہے اور چاروں مذاہب میں اس کا اثر کس طرح مختلف ہے، پھر اپنے فکری تاثرات ہمارے سامنے رکھے اور بتائے کہ صرف اسی مسئلے میں چاروں مذاہب کو کس طرح یکساں کیا جاسکتا ہے؟

مصنفِ بوطی پر الزام اور اسکی حقیقت

شیخ ناصر نے (صفحہ 77) لکھا کہ میں (مصنفِ بوطی) نے لوگوں اس بات کی دعوت دی ہے کہ وہ تمام احکام میں مذاہب کے مطابق رہیں، چاہے بعض احکام کتاب وسنت کے واضح دلائل کے خلاف ہوں، اور یہ بات میں (مصنف بوطی) نے اپنی رسالہ میں (ص74-75) لکھی ہے۔

محترم قارئین! پوری توجہ کے ساتھ میرے پورے رسالہِ ہذا (اللامذھبیہ) کا مطالعہ کیجئے، کیا کہیں بھی یہ بات موجود ہے؟ نہیں، بلکہ اس کے بر عکس میں نے اسی کتاب کے ص70 پر واضح کہا کہ:

اگر کوئی حدیث آپ کے امام کے نظریے کے بر خلاف حکم دے اور آپ اس حدیث کی صحت اور دلالت کی تصدیق کرلیں، تو آپ کو اس حدیث کی پیروی کرنی چاہیے اور اپنے امام کے مذھب پر اس حکم میں قائم نہیں رہنا چاہیے۔ اگر میرے رسالہ میں یہ سراسر جھوٹا الزام (جو البانی نے مجھ پر لگایا) نظر آئے تو سمجھ لیجیے کہ یہ غیر ذمہ دارانہ اور غلط ہے، اس قسم کی بداعمالی انسانیت اور اسلامی شریعت میں کہاں بیٹھتی ہے؟

مفتی اور عالم کے درمیان فرق

میں نے اسی کتاب کے ص 42 پر واضح کیا تھا کہ لفظ "مفتی" اصل میں صرف اجتہاد مطلق کرنے والے کے لیے استعمال ہوتا تھا، اور صدر اسلام میں یہی رویہ تھا، اس کی تفصیل نووی کی کتاب المجموع یا

دیگر اصولی اور فقہی کتب میں موجود ہے۔ پھر بعد میں "مفتی" کا لقب مجازاً ہر اس شخص پر استعمال ہونے لگا جو لوگوں کو شرعی احکام پہنچاتا ہے، چاہے وہ خود تقلید کرنے والا ہی کیوں نہ ہو، اسی لیے علماء کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص فتویٰ دیتا ہے تو اسے حکم کا ماخذ واضح کرنا چاہیے، اور اپنی رائے سے فتویٰ نہیں دینا چاہئے، کیونکہ وہ دراصل صرف کسی بھی مذہب فقہ کا نقال ہے۔

شیخ ناصر یا محمود مہدی اس بات کو غلط سمجھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ "عالم" اور "مفتی" ایک ہی ہیں، وہ علماء سے مشورہ کر کے پوچھتے ہیں کہ :

کیا آپ قبول کرتے ہیں کہ صرف مجازاً ہی عالم ہیں؟ (ص 81)

جس طالب علم نے بھی تھوڑی بہت فقہ اور اصول پڑھیں ہوں، وہ عالم اور مفتی میں فرق جانتا ہے: ہر مفتی عالم ہوتا ہے، لیکن ہر عالم مفتی نہیں ہوتا۔ جہاں تک میں نے دیکھا کہ انہوں نے میری بات پر اس طرح تبصرہ کیا، اللہ کی قسم، مجھے اس پر گھبراہٹ اور واقعی ناپسندیدگی ہوئی۔ کیوں کسی ایک فقہی مذہب کی پابندی ناجائز نہیں۔

شیخ ناصر اور ان کے ساتھی نے میری اسی کتاب میں موجود ان دلائل کا جواب دینے کی کوشش کی جن میں میں نے واضح کیا تھا کہ کسی ایک فقہی مذہب کی پابندی حرام نہیں، جب تک کوئی یہ عقیدہ نہ رکھے کہ ایسا کرنا واجب ہے۔ (دیکھیے: صفحہ 88 اور اس کے بعد کے صفحات)

ان کے تمام کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے میرے دلائل کا جواب صرف مندرجہ ذیل باتوں میں دیا:

پہلی بات :

مطلوب پر مصادرۃ" یعنی (بغیر دلیل کے انکار) انہوں نے کہا کہ کسی ایک مذہب کی پابندی بدعت ہے،

یہ بات علمی لحاظ سے محض دعویٰ کا انکار ہے، دلیل کا رد نہیں، ہر وہ شخص جو تحقیق کے طریقوں سے واقف ہے، جانتا ہے کہ یہ مطلوب پر مصادرۃ ہے([1])، نہ کہ دلیل کا باطل کرنا۔

دوسری بات :آسانی کا دعویٰ:

ان کا کہنا ہے کہ کسی خاص مذہب کی پابندی نہ کرنا زیادہ آسان، اصل کے قریب، اور اللہ کے حکم کے صحیح فہم کے زیادہ قریب ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس میں کوئی علمی دلیل ہے جو میرے پیش کردہ دلائل کو باطل کرتی ہو؟ نہیں، بلکہ یہ تو میرے اسی دعوے کا محض تکرار ہے جو میں نے اپنی کتاب میں کیا۔

تیسری بات: معصوم اور غیر معصوم میں فرق

ان کا کہنا ہے کہ کسی ایک مذہب کی پابندی نہ کرنا اُس اصول کے مطابق ہے جو معصوم (یعنی نبی ﷺ) اور غیر معصوم (یعنی عام علماء) کی پیروی میں فرق کرتا ہے۔

ذرا اس دلیل پر بھی غور کیجیے۔

([1]) المصادرۃ علی المطلوب" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کے دعوے کے مقابلے میں صرف اس دعویٰ کی نقیض پیش کرے اور اسی کو دلیل سمجھ لے،

یہ دراصل دلیل نہیں بلکہ موضوعِ نزاع کا تکرار ہے اور موضوعِ نزاع تو خود دلیل کا محتاج ہوتا ہے چہ جائیکہ اسی کو دلیل بنالیا جائے۔

کیااس بات میں کوئی ایسی چیز ہے جو میرے دلائل کو باطل کرے؟

معصوم اور غیر معصوم کے فرق پر ہم اس رسالے میں پہلے بھی بات کر چکے ہیں اور اس میں موجود غلط فہمیوں کو واضح کر چکے ہیں۔

چوتھی بات : صحابہ اور سلف کا طرزِ عمل۔

ان کا کہنا ہے کہ صحابہ کرام اور سلف صالحین (پہلی تین نسلوں کے نیک لوگ) کسی خاص فقہی مذہب کے پابند نہیں تھے، بلکہ وہ جان بوجھ کر کسی ایک مذہب کی پابندی سے گریز کرتے تھے۔ یہی وہ ایک دلیل ہے جو اگر صحیح ہو تو میرے پیش کردہ دلائل کو باطل کر سکتی ہے۔

لہٰذا دیکھتے ہیں کہ:

کیا یہ درست ہے کہ صدرِ اول کے لوگ کسی خاص فقہی طرزِ فکر کی پابندی نہ کرنے کے پابند تھے؟ شیخ ناصر اور ان کے ساتھی یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ: اہلِ عراق نے فقہ عبداللہ ابن مسعودؓ اور ان کے شاگردوں سے حاصل کی، اہلِ حجاز نے فقہ عبداللہ ابن عمرؓ اور ان کے شاگردوں سے لی، اور بعض صحابہ ایسے تھے جو صرف ابن مسعودؓ یا ابن عباسؓ ہی سے فتویٰ لیا کرتے تھے۔ اب وہ امام ابن القیمؒ کے درج ذیل قول کے بارے میں کیا کہیں گے جو انہوں نے (اِعلام الموقعین" جلد 1، صفحہ 21 میں لکھا ہے کہ:

دین، فقہ اور علم امت میں ابن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ ابن عمرؓ اور عبداللہ ابن عباسؓ کے شاگردوں کے ذریعے پھیلا۔ اہلِ مدینہ کا علم زید بن ثابتؓ اور ابن عمرؓ کے شاگردوں سے تھا، اہلِ مکہ کا علم ابن

عباسؓ کے شاگردوں سے، اور اہلِ عراق کا علم ابن مسعودؓ کے شاگردوں سے حاصل ہوا۔ یہ وہ بات ہے جو صرف ہم ہی نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو تاریخِ تشریع (اسلامی قانون سازی کی تاریخ) کا مطالعہ کرتا ہے، وہ بھی جانتا ہے،

یہی ہمارے ائمہ اور اسلاف رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تاریخ کے تمام محققین کے نزدیک:

عطاء بن ابی رباحؒ اور مجاہدؒ کو خلیفہ کے حکم اور تمام صحابہ وتابعین کی منظوری سے مکہ میں فتویٰ دینے کی اجازت ملی تھی، چنانچہ لوگ صرف انہی دو میں سے کسی ایک سے فتویٰ لیا کرتے تھے۔

تو اے تحقیقی وتالیفی کمیٹی!

کیا التزام (یعنی کسی عالم یا مذہب کی پابندی) کا مطلب اس کے سوا کچھ اور ہے؟

پانچویں بات : مذاہب اور قرات کا قیاس

مخالف لکھتا ہے کہ میں نے مذاہب کو قرائت پر قیاس کیا جو کہ ظاہری مغالطہ ہے۔ کیونکہ قرائت سب کی سب رسول اللہ ﷺ سے متواتر طور پر منقول ہیں، جبکہ فقہی مذاہب میں ایسا نہیں، ان میں کچھ صحیح اور کچھ غلط باتیں ہیں۔ ہم اس مسئلے کو واضح کرتے ہیں کہ:

جو شخص علم میں اس درجے تک پہنچ چکا ہو کہ مذاہب کی آراء میں صحیح و غلط کی تمیز کر سکے، اس کے لیے تو کسی مذہب کی تقلید ابتداءً جائز ہی نہیں نہ التزام کی صورت میں، نہ بغیر التزام کے، لیکن جو شخص اس درجۂ علم تک نہیں پہنچا، اس کے لیے تمام مذاہب برابر حیثیت رکھتے ہیں، علماء کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ جس مذہب کی چاہے تقلید کر سکتا ہے، یہ اجماع متواتر شہرت سے ثابت ہے جس میں کسی شک کی

گنجائش نہیں، لہٰذا اس کے لیے مذاہب کی حیثیت بالکل وہی ہے جو عام مسلمانوں کے لیے قراءات کی ہے۔ جس طرح عام مسلمانوں کے لیے تمام قراءات صحیح ہیں، اسی طرح جو شخص اجتہاد پر قادر نہیں یا ائمہ کی آراء میں صحیح وغلط کی پہچان نہیں رکھتا، اس کے لیے چاروں فقہی مذاہب صحیح ہیں۔ تو پھر ایسے شخص کے حق میں جو اجتہاد سے عاجز ہو مذاہب (مقیس) اور قراءت (مقیس علیہ) میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟

چھٹی بات: اکثریت کے باطل ہونے کا استدلال

شیخ ناصر اور ان کے دونوں ساتھی کہتے ہیں کہ

میں نے جو ہزاروں علماء اور عوام کی مثال دی جو امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کی پیروی کرتے تھے یہ دلیل باطل ہے، کیونکہ ان کے بقول یہ سب کے سب باطل پر تھے!

پھر وہ قرآن کی اس آیات سے استدلال کرتے ہیں:

وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ" (یوسف: 103)

"وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ" (الأنعام: 116)

ہم ان بھائیوں کے لیے دل کشادہ رکھتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ:

یقیناً قرآن وسنت میں ایسی نصوص موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ اکثر لوگ حق پر نہیں ہوتے اور حق والوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے، لیکن اسی قرآن وسنت میں ایسی صحیح احادیث بھی ہیں جو تقریباً معنوی تواتر کے درجے تک پہنچتی ہیں، جو مسلمانوں کو جماعت کے ساتھ رہنے اور اس سے الگ نہ ہونے کا حکم دیتی ہیں۔

صفحہ نمبر 170

باطل فرقوں کے درمیان اہلِ حق کی پہچان

ان روایات میں سے ایک روایت ابن ماجہ نے انس بن مالک سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری اُمت بہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، سب دوزخ میں ہوں گے سوائے ایک کے، اور وہ ہے 'اہلِ سنت والجماعت'۔" زوائد میں ذکر ہے کہ اس روایت کی سند صحیح ہے اور اس کے راوی قابل اعتماد ہیں۔

اسی طرح ترمذی اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ عمر بن الخطاب سے روایت کی کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

تم سب پر جماعت کی پابندی لازم ہے اور فرقہ واریت سے بچو، کیونکہ شیطان اکیلے کے ساتھ زیادہ اثر رکھتا ہے اور دو کے ساتھ کم، اور جو جنت کی وسعت چاہتا ہے اسے جماعت کے ساتھ رہنا چاہیے۔

ترمذیؒ نے کہا: یہ حدیث صحیح اور نادر ہے، اور ابن المبارکؒ نے اسے محمد بن سوقہ سے روایت کیا، نیز یہ حدیث عمر بن الخطابؓ سے بغیر سند کے بھی روایت ہوئی ہے۔

اسی طرح ترمذی نے ابن عمر سے روایت کی کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

اللہ میری اُمت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا، اور اللہ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے، جو الگ ہوا وہ آگ میں ہوگا۔ ترمذی نے وضاحت کی کہ اہل علم کے نزدیک 'الجماعت' سے مراد وہ لوگ ہیں جو فقیہ اور محدث ہوں۔

شیخین نے حذیفہ بن یمانؓ سے بھی روایت کی کہ انہوں نے کہا:

لوگ رسول ﷺ سے بھلائی کے بارے میں پوچھتے اور میں برائی (شر) کے بارے میں پوچھتا۔

میں نے پوچھا:

کیا برائی کے بعد بھی کچھ بھلائی باقی ہے ؟رسول ﷺ نے فرمایا:

"ہاں،اس میں دخن ہے۔"میں نے پوچھا:"دخن کیا ہے ؟

حذیفہؓ نے کہا: رسول ﷺ نے فرمایا:

یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو ہدایت کی بجائے غلط راستے پر لے جاتے ہیں، جو ان کے پیچھے چلیں انہیں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ میں نے پوچھا:

یارسول ﷺ، انہیں ہمارے لیے بیان کریں؟

رسول ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ ہماری ہی نسل اور قوم کے ہیں اور ہماری زبان سے بات کرتے ہیں، میں نے پوچھا:

اگروہ دن میرا بھی آجائے تو مجھے کیا کرنا چاہیے ؟رسول ﷺ نے فرمایا:

تم مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کے ساتھ رہنا۔

کئی علماء نے مختلف روایتوں کو اس معنی میں دیکھ کر کہا کہ یہ تقریبا تواتر تک پہنچ گئی ہیں، اصولی علماء نے ان احادیث کو اجماع کی مشروعیت پر سب سے مضبوط دلیل قرار دیا، اور الآمدی نے کہا کہ یہ اجماع کی حجیت کے لیے سب سے مضبوط دلیل ہیں۔

اب اگرچہ وہ آیات جو مصنف نے پیش کیں اور یہ احادیث بظاہر ایک دوسرے کے متضاد لگتی ہیں، لیکن محقق عالم وہ ہے جو نصوص کی گہرائی میں جا کر صحیح مفہوم نکالے اور متضاد نصوص میں توازن قائم کرے، وہ کوئی نہیں جو سطحی دلائل دیکھ کر سخت فیصلے کرے اور ہزاروں محدثین و فقہاء کو غلط کہے کیونکہ انہوں نے چاروں مذاہب میں سے کسی ایک کو اختیار کیا، قرآن کا بیان عام انسانوں کے لیے ہے، یہ حقیقت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔

جماعت اور سوادِ اعظم

اللہ پر ایمان رکھنے والی اور اس کے طریقے پر چلنے والی جماعت زمین پر بہت کم ہے، جیسے سیاہ بیل کی کھال پر سفید دھبہ، یہ وہ غُربت ہے جس کا ذکر رسول ﷺ نے فرمایا۔

جو احادیث ہم نے بیان کیں، وہ اسلام کے دائرے میں اکثریت یعنی 'سوادِ اعظم' کے لیے ہیں، اگر مسلمانوں اور علماء کے درمیان اختلاف ہو تو قرآن اور سنت ہی حاکم ہیں، عمومی ممالک کے علماء کی اکثریت ہمیشہ قرآن و سنت کے قریب رہتی ہے، جو بھی ان کے دور میں انحراف ہوا، وہ صرف چھوٹے فرقوں کی غلطی تھی۔ جماعت اور اکثریت ہی اس بات کی بہترین مثال ہیں کہ قرآن اور سنت کی پابندی کیسے کی جائے،

خوارج، جہمیہ، مرجئہ اور قدریۃ سب اکثریت کے مقابلے میں بہت کم ہیں،

اب سوال یہ ہے کہ :

کیا وہی حق کے نمائندے ہیں جنہیں شیخ ناصر اور اس کے ساتھی درست مانتے ہیں؟

کس نے یہ کہا؟

اور کون سا مسلمان اس غیر معمولی اختلاف کو حق میں تسلیم کرتا ہے، چاہے علم یا فکر میں ہو؟

امام شافعیؒ کے اس قول کا مفہوم کہ جب کوئی صحیح حدیث ہو تو

میں نے اپنے اس رسالہ میں واضح کر دیا تھا کہ امام شافعیؒ کے قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ :

اگر حدیث صحیح ہو تو یہ میرا مذہب ہے۔یعنی ہر شخص جو صحیح حدیث دیکھے اور اس کا ظاہری مفہوم شافعی کے مکتب کے مخالف ہو تو کیا وہ اسے تقلید کے دائرے میں اختیار کر سکتا ہے ؟

جواب یہ ہے کہ :

نہیں کر سکتا کیونکہ تقلید کرنے والے کے لیے خاص ضوابط اور حدود ہیں، اور یہ بات امام نووی کی کتاب المجموع کے مقدمے میں بیان ہوئی ہے۔ کمیٹی نے کہا کہ میں نے نووی کی بات کو غلط سمجھا، اور نووی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ حدیث کو ان ضوابط کے بغیر اختیار نہ کیا جائے۔

میں ان لوگوں سے درخواست کرتا ہوں جو عربی زبان اور الفاظ کے معنی سمجھتے ہیں کہ نوویؒ کی کتاب (صفحہ 164، جلد 1، طبع المنیریہ) پڑھیں، خاص طور پر یہ جملہ :

اور شافعیؒ کے قول کا مطلب یہ نہیں کہ ہر کوئی جو صحیح حدیث دیکھے، کہے یہ شافعی کا مذہب ہے اور اس پر عمل کرے۔ ہماری گفتگو خاص طور پر ان لوگوں کے لیے ہے جو مجتھد نہیں بلکہ مقلد ہیں،

سوال یہ ہے کہ تقلید کرنے والا، کیا وہ کسی حدیث کو اختیار کر سکتا ہے جس کا ظاہری مفہوم مذہب شافعی کے مخالف ہو ؟

جواب ہے کہ : وہ مخصوص حدود میں ایسا کر سکتا ہے، کیونکہ وہ مجتہد نہیں، لیکن اگر کوئی شخص مجتہد ہو، تو نووی کے یہ تمام ضوابط اور حدود اس پر منطبق نہیں ہوتے، مجتہد شافعی کے برابر ہے، وہ دلائل کو اپنی فہم اور استنباط کے مطابق اختیار کرے یا چھوڑے جیسا چاہے۔

کیا مذاہبِ اربعہ کے درمیان تعصب ہے؟

الاستنبولی اور اس کے ساتھیوں نے اس کتاب میں دو بڑے ابواب رکھے:

1 : کیوں ہم سنت کی طرف رجوع کرتے ہیں؟

2 : مذہبی تعصب اور اس پر ہماری تنقید۔

یہ دونوں ابواب صفحہ 116 سے 232 تک پھیلے ہوئے ہیں۔

مصنف نے ان صفحات میں چاروں مذاہب کے پیرو کاروں اور فقہاء کے بعض عیوب و کمزوریوں کو جمع کیا، تاکہ یہ دکھا سکے کہ:

بعض اوقات مذاہبِ اربعہ میں سخت تعصب پایا جاتا ہے، بعض نایاب اور کم وقوع پذیر مسائل کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، بعض صحیح احادیث کو نظر انداز کر کے صرف کسی مخصوص مذہب کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ اس نے معاصر لوگوں کی کمزوریوں کا ذکر بھی کیا، جن پر کوئی مضبوط دلیل نہیں تھی، لیکن مصنف نے انہیں بڑے علمی القابات سے نوازا اور پھر انہی القابات کے ساتھ انہیں اپنی تنقید میں شامل کیا،

یہ سب کچھ اس نے اپنے سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کیا، اور دورانِ گفتگو بعض اوقات ائمہ کرام پر طنز اور القابات جیسے: جہالت، حماقت، اور سفا کی استعمال کیے، حالانکہ یہ ائمہ پوری دنیا میں علم و فضل کے باعث محترم تھے اور کسی کے بس میں نہیں کہ انہیں اجر دے سکے سوائے اللہ کریم کے۔

آخر میں مصنف نے یہ نتیجہ نکالا کہ:

اگر آپ، قاریِ محترم،

اس وضاحت کو سمجھ لیں تو آپ جان لیں گے کہ ڈاکٹر البوطی بالکل غلط تھے جب انہوں نے شیخ المعصومی پر تنقید کی کہ انہوں نے چاروں مذاہب کے مطابق عمل کرنے کی وجہ صرف سیاسی اور دیگر ذاتی مفادات کہے۔ (ص222)

دور کی بعید فرضیات

ہماری رائے یہ ہے کہ ہم مذہبی تعصب کو قطعی طور پر رد کرتے ہیں اور اس بات کو بھی بے فائدہ سمجھتے ہیں کہ ہم بعید اور نادر وقوع پذیر مفروضات کی پیروی میں اپنا وقت ضائع کریں، اسی طرح، ہم اس بات کی بھی تردید کرتے ہیں کہ صحیح حدیث کو نظر انداز کیا جائے، جب تک کہ اس کے معنی یا مفہوم کی صداقت پر یقین کر لیا جائے، چاہے وہ کسی فقہی مکتب کے ظاہری موقف کے خلاف کیوں نہ ہوں، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، لیکن اس سب کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ہم مشرق و مغرب میں پھیلے کے فقہی مذاہب کو یکساں طور پر دیکھیں اور کہیں کہ تمام مذاہب صرف سیاستی مفادات یا ذاتی اغراض کی وجہ سے وجود میں آئے اور پھیلے، اور یہ بھی ہر گز جائز نہیں کہ ہم فقہاء کے کچھ غلط بیانات یا کمزوریوں کو بنیاد بنا کر ان کے بڑے علمی اور فقہی فضل کو کم شمار کریں، یاد رکھیں، وہ ائمہ اور فقیہ حضرات جن کی علمی خدمات کی وجہ سے آج ہم علم سے مستفید ہیں، انبیاء معصوم نہیں تھے، بلکہ وہ بڑے فضائل کے حامل انسان تھے، ان پر بھی انسانی نوع کی بعض کمزوریاں یا غلطیاں ممکن ہیں۔

ایسا شخص جو حقیقی فضیلت اور علم میں بلند ہے، وہ اپنے بزرگ علماء کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر توجہ نہیں دیتا، بلکہ ان کے عظیم کارناموں اور انسانیت کے لیے کیے گئے خدمات کو یاد رکھتا ہے، میں جانتا ہوں کہ

اس کتاب کے ایک مصنف (یعنی وہ جو زیادہ تر تنقید پر مرتکز رہتے ہیں) نے طویل عرصے سے ائمہ وفقہاء کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلاش میں وقت صرف کیا ہے۔

اس تحقیق میں، بلاشبہ، وہ بے شمار علمی تحقیقات اور فقہی ذخائر سے گزر چکے ہیں، جن تک دنیا کی کوئی قانون سازی یا طاقت نہیں پہنچ سکتی۔ اگر وہ واقعی چاہتا تو ان عظیم علماء کے کام سے کم از کم علم، بصیرت یا فہم حاصل کر سکتا تھا، اور ان کی علمی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا، لیکن اس شخص نے ان سب سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ وہ اپنی تحقیق سے صرف چھوٹی چھوٹی غلطیاں یا کوتاہیاں تلاش کر کے خوش ہوا، اور ان کو احمق، کمزور، گمراہ یا منحرف قرار دے کر ان پر الزام لگایا۔ حالانکہ، زیادہ تر جو وہ غلطیاں یا نقصانات سمجھتا ہے، وہ صرف اس کے اپنے تصور یا فہم کی غلطیاں ہیں، مثال کے طور پر، وہ امام الشافعی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک غلط فہمی پر مبنی طنز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ امام الشافعی نے مرد کو اپنی بیٹی کے نکاح کی اجازت دی۔

اصل بات یہ ہے کہ یہاں مراد وہ لڑکی ہے جس کا نکاح کسی سفاح (یعنی نکاح سے پہلے شادی شدہ کسی شخص) سے کیا گیا تھا، اور وہ اس امام الشافعیؒ کی اپنی بیٹی نہیں تھی، لہٰذا اس نکاح میں کوئی شرعی ممانعت نہیں تھی، اگر وہ شخص امام الشافعیؒ کے کلام کو صحیح طور پر پڑھتا اور سمجھتا، تو وہ اپنی غلط فہمی درست کر لیتا اور اس طرح کی طنزیہ باتیں نہ کرتا۔

ائمۂ دین کی تنقیص پر سخت تنبیہ

اے غافل! کیا تُو نے پہلے اپنی نفس کی اصلاح مکمل کر لی ہے؟

کیا تُو نے خود کو اُس حماقت، گمراہی[1] کم عقلی اور شرعی چال بازی سے پاک ثابت کر لیا ہے، جن عیوب کا الزام تُو اُن جلیل القدر ائمہ پر لگا رہا ہے؟

ذرا سوچ! یہ وہی ائمہ ہیں جن کے علم و فضل کے دستر خوان سے آج تُو خود فیض یاب ہو رہا ہے، اور اب انہی کی عزت کو پامال کر رہا ہے، اے شخص غافل!

تیرے اپنے شیخ نے جب وہ "خنجدی" کے دفاع میں لکھ رہے تھے یہی اصول بیان کیا تھا کہ:

ہم پر لازم ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں ہمیشہ اچھی رائے رکھیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کے لیے عذر تلاش کریں۔ تو کیا تیرے شیخ نے تجھے یہ نہیں بتایا کہ:

یہ اسلامی اصولِ عظیم صرف خنجدی اور اس جیسے لوگوں کے لیے خاص نہیں، بلکہ تمام مسلمانوں کے حق میں واجب الاحترام ہے؟ اے غافل!

میں تجھ سے اللہ عظیم کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، اگر تُو اس پر ایمان رکھتا ہے:

کیا کبھی تیرے دل میں یہ خوف نہیں جاگا کہ شاید اللہ تجھ پر کوئی ایسا عذاب نازل کر دے جس سے تُو کبھی نجات نہ پا سکے؟ ایسا عذاب، جو تیرے اُن بے باک الفاظ اور بدزبانی کا بدلہ ہو جو تُو ان ائمہ کرام اور علماء دین کے خلاف بولتا ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی دینِ الٰہی اور شریعت کی خدمت میں گزاری، اور یوں اللہ تجھے دیکھنے والوں کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں عبرت کا نشان بنا دے!

([1]) ۔ ان ائمہ پر جس بات کا الزام اس شخص نے لگایا کہ وہ شرعی احکام میں چالاکی کرتے ہیں ہم نے اس کی تفصیل اپنی کتاب "ضوابط المصلحة في الشريعة الإسلامية" میں وضاحت سے لکھی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ شخص اس کتاب کا ایک صفحہ بھی صحیح طور پر سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

علماء وائمہ کی عزت اور ان پر زبان درازی کی وعید

میں ان تمام بھائیوں کو سختی سے متنبہ کرتا ہوں جو اس قسم کے انسان کی تحریروں کو پڑھتے ہیں میں نے اپنی پوری زندگی میں اس شخص سے زیادہ آئمہ وفُقہاء کی عزت کو نوچنے والا کوئی اور نہیں دیکھا، اس شخص کو پڑھنے والے کہیں اس کی روش کے عادی نہ بن جائیں:

یعنی ائمہ کی توہین، ان کے مقام میں کمی، اور ان کی لغزشوں میں لذت تلاش کرنے کی عادت! انہیں چاہیے کہ امام نوویؒ کی کتاب المجموع کے مقدمہ میں موجود وہ فصل پڑھیں

جس کا عنوان ہے:

فقہاء اور متفقھین کو ایذا پہنچانے، ان کی تنقیص کرنے پر سخت ممانعت اور ان کے ساتھ احترام و تعظیم کے ساتھ پیش آنے کی ترغیب۔ اس باب کے آخر میں امام نوویؒ نے حافظ ابن عساکرؒ کا قول نقل کیا ہے: اے میرے بھائی! اللہ تجھے اور مجھے اپنی رضا کی توفیق دے، اور ہمیں اُن لوگوں میں شامل کرے جو اس سے ڈرتے اور پرہیزگاری کرتے ہیں۔ یاد رکھ! علماء کا گوشت زہر آلود ہوتا ہے، اور جو ان کی بے حرمتی کرتا ہے، اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ اُس کے پردے دنیا میں ہی چاک کر دیتا ہے، جو اپنی زبان علماء کے خلاف بدگوئی میں کھولتا ہے، اللہ اسے مرنے سے پہلے دل کی موت کے عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔

لہٰذا، تم مذاہب میں تعصب سے بچو اور اپنا وقت ان فرضی مسائل میں ضائع نہ کرو جن کا وقوع تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن ساتھ ہی، فقہاء کا احترام کرو ان کے دفاع میں بات کرو اور ان کے لیے دعا گو رہو۔

یاد رکھو! یہ ہرگز ضروری نہیں کہ اختلاف کے باوجود کسی عالم یا فقیہ کو حماقت، بے وقوفی یا ہنسی مذاق کا نشانہ بنایا جائے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے کلام میں نہایت خطرناک اور مکارانہ تحریف

میں پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ معصومی نے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حوالے سے اپنی کتاب الِانصاف میں جو بات نقل کی ہے، وہ من گھڑت اور جھوٹا قول ہے، جس کی الِانصاف میں اور نہ کسی دوسری کتاب میں کوئی بنیاد موجود ہے۔ وہ جملہ جو دہلویؒ کی طرف جھوٹے طور پر منسوب کیا گیا، یہ ہے:

جو شخص امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ یا کسی اور کے تمام اقوال کو لے کر چلے، اور کتاب و سنت کی طرف رجوع نہ کرے، تو اس نے پوری امت کے اجماع کی مخالفت کی اور مومنین کے راستے سے ہٹ گیا۔

میں نے الِانصاف سے اس کے بالکل برعکس عبارت نقل کی تھی، جو یہ ہے:

یہ چاروں مدون و مستند فقہی مذاہب وہ ہیں جن کے تقلید کرنے پر امت (یا اس کے معتبر اہلِ علم) کا آج تک اجماع قائم ہے، اور ان کی پیروی قیامت تک جائز اور معتبر ہے۔ میری توقع یہ تھی کہ جو لوگ مجھ پر تنقید میں متحد ہو گئے ہیں، وہ ذرا ٹھہر کر معاملے پر غور کریں، میرے بیان کردہ موقف کو سنجیدگی سے دیکھیں اگر اسے صحیح پائیں تو اتفاق کریں، ورنہ کم از کم خاموشی اختیار کریں، مگر ایسا نہ ہوا بلکہ وہ ایک عجیب و غریب طرز پر میرے خلاف لکھنے لگے، اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ گویا دہلویؒ نے وہی الفاظ ذکر کیے ہیں جو معصومی نے ان سے منسوب کیے، چاہے وہ انہیں الفاظی چالاکی اور بیانی ملاوٹ سے ہی کیوں نہ ثابت کریں!

اب ان کی یہ ''تحقیقی'' کوشش ملاحظہ فرمائیے:

ان کی ''تالیف کمیٹی'' نے لکھا کہ:

ہم نے دہلویؒ کی رسالہ اِلا نصاف کا مطالعہ کیا، تو اس میں ہمیں معصومی کے بیان کردہ کچھ الفاظ کے مماثل عبارت ملی، جس کا متن یہ ہے:

جان لو کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں لوگ کسی ایک مخصوص مذہب کے پابند نہ تھے، ابو طالب المکیؒ نے قوت القلوب میں لکھا:

کتابیں اور فقہی مجموعے بعد کے دور کی پیداوار ہیں۔ ابتدائی دو صدیوں میں لوگ کسی ایک امام یا مکتب کے اقوال کے پابند نہ تھے، وہ ایک ہی شخص کے قول پر جم نہیں جاتے تھے بلکہ عام طور پر لوگ دو درجوں میں تقسیم تھے علماء اور عوام۔ عام لوگوں کا حال یہ تھا کہ جن مسائل میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا، وہ براہِ راست صاحبِ شریعت ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے، اور اگر کوئی نادر مسئلہ پیش آتا تو جس مفتی کو پاتے، اس سے سوال کرتے کسی ایک مذہب یا امام کی تعیین کے پابند نہ تھے،

ابن الہمامؒ نے التحریر کے آخر میں لکھا ہے:

لوگ ایک بار کسی سے فتویٰ لیتے اور کبھی کسی دوسرے سے کسی ایک مفتی یا فقیہ کے ساتھ مخصوص نہیں تھے۔ اب جب ہم نے اِلا نصاف (منصوریہ ایڈیشن، فاروق پرنٹنگ پریس) کا بغور مطالعہ کیا، تو ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آخری سطر یعنی وہ عبارت جسے انہوں نے نقل کے طور پر پیش کیا در حقیقت اس مقام پر سرے سے موجود ہی نہیں!

اب سوال یہ ہے کہ:

کیا قاری کو اس نقل کردہ متن میں کوئی ایسی بات ملتی ہے جو معصومی کے جھوٹے قول سے میل کھاتی ہو؟ یا ان دونوں میں کسی قسم کی مشابہت پائی جاتی ہے؟

پھر وہ مصنف آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ :

باقی حصہ دہلویؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جلد 1، صفحہ 154–155 میں موجود ہے۔اس میں دہلویؒ نے امام ابنِ حزمؒ کا قول نقل کیا ہے۔ چنانچہ ہم دہلویؒ کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

'ابنِ حزمؒ نے کہا : تقلید حرام ہے،

اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کرے۔

دہلویؒ نے ابنِ حزمؒ کا یہ قول نقلاً بیان کیا تھا۔ مگر معصومی نے اسے دہلویؒ ہی کا قول قرار دے دیا اور میں نے اپنی اس پوری رسالہ میں یہی کہا تھا کہ یہ دہلویؒ پر صریح بہتان ہے، اس کے باوجود کتاب کے مصنف نے میری اس تصحیح پر ردِ عمل کے طور پر میرے خلاف جھوٹ، جلد بازی، اور فریب جیسے الزامات کی بارش کر دی!

دہلویؒ کا اصل موقف اور ابنِ حزمؒ کے حوالے کی حقیقت

اب آیئے! دیکھتے ہیں کہ دراصل امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ (طبع خیریہ، جلد 1، صفحہ 123) میں ابنِ حزمؒ کے بارے میں کیا فرمایا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ: جان لو کہ یہ چاروں فقہی مذاہب مدون اور مستند ایسے ہیں جن کے تقلید کرنے پر امت یا اس کے معتبر علماء کا اجماع چلا آ رہا ہے، اور آج تک ان کی پیروی جائز مانی گئی ہے، اس میں بے شمار مصلحتیں پوشیدہ ہیں، خصوصاً آج کے زمانے میں، جب لوگوں کی ہمتیں کمزور پڑ گئی ہیں، نفوس خواہشات سے مغلوب ہیں، اور ہر شخص اپنی رائے پر اڑا ہوا ہے۔

پھر اسی بات کے فوراً بعد دہلویؒ فرماتے ہیں کہ :

لہٰذا ابنِ حزمؒ کا یہ قول کہ تقلید حرام ہے اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کرے، یہ بات صرف اُس شخص پر منطبق ہو سکتی ہے جس میں کسی درجے کا اجتہاد موجود ہو، چاہے وہ کسی ایک مسئلے ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد دہلویؒ نے اجتہاد کی شرائط تفصیل سے بیان کیں اور اس پورے مسئلے میں صحیح موقف کو کھول کر واضح کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ان لوگوں نے کیا کیا جو ہمیں "جھوٹا، فریبی اور جلد باز" کہنے میں کوئی جھجک نہیں کرتے؟ انہوں نے عجب کاریگری دکھائی سب سے پہلے دہلویؒ کے اصل ماخذ اور سیاق کو مکمل حذف کر دیا، پھر اس عبارت کا ابتدائی حصہ (يعنى فما ذهب إليه ابن حزم...) سے "ما" الموصولۃ کو کاٹ دیا، اور پھر اس کے آخری جملے جو دہلویؒ کا تبصرہ تھا کو بھی غائب کر دیا۔ یوں دہلویؒ کی عبارت کے صرف ایک حصے کو جو محض ابنِ حزمؒ کا قول نقل کر رہا تھا الگ نکال کر ایسے پیش کیا گویا دہلویؒ نے خود یہی بات تسلیم کی ہے!

انہوں نے دہلویؒ کی عبارت کو یوں بنا دیا:

قال ابن حزم: التقليد حرام۔

اور اس طرح دہلویؒ کی عبارت کو ایسے رنگ میں پیش کیا جیسے وہ ابنِ حزمؒ کے نظریے کے حامی ہوں، حالانکہ حقیقت میں دہلویؒ اس قول کو رد کر رہے تھے اور اس کا علمی تجزیہ پیش کر رہے تھے۔ یہ بات ہر منصف قاری پر صاف ظاہر ہے کہ دہلویؒ نے اس قول کو اقراراً نہیں، بلکہ تنقیداً ذکر کیا تھا!

میں چاہتا تو اس عجیب اور خطرناک تحریف سے چشم پوشی کر لیتا، اور ایسے لغو طرزِ تحریر کو نظر انداز کر کے خاموشی اختیار کر لیتا، لیکن اللہ کی امانت، علم اور دیانت کا تقاضا ہے کہ میں امتِ مسلمہ کو متنبہ کروں ان لوگوں کے فریب کارانہ انداز سے جو دین کی خدمت کے دعویدار بن کر لوگوں کو اپنی پیروی کی

دعوت دیتے ہیں اور ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے ترجمان بننے کا دعویٰ کرتے ہیں، اگر میرے یہ الفاظ کسی کو سخت محسوس ہوں تو میں کہتا ہوں:

خود تحقیق کر لیجیے! حجۃ اللہ البالغہ کا حوالہ (جلد 1، صفحہ 123) سامنے رکھیں،

پھر کتاب المذهبية المتعصّبة هي البدعة کی صفحہ 287 کھولیں،

پڑھیئے، موازنہ کیجیے، پھر خود فیصلہ کیجیے کہ حقیقت کیا ہے۔ ہر باشعور شخص اس موازنہ سے وہی نتیجہ اخذ کرے گا جو ایک دیانتدار محقق کو کرنا چاہیے۔ ([1])

([1])۔ ہم ان تمام لوگوں سے، جواب بھی اس شخص یا اس کے حامی طبقے کے اثر میں ہیں
خواہ وہ عوام ہوں یا اہلِ علم یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ:
کیا آپ کے نزدیک یہ درست ہے کہ کوئی شخص کسی مصنف کے اصل جملے فما ذهب إليه ابن حزم حيث قال إن التقليد حرام... وإنما يتم فيمن له ضرب من الاجتهاد" سے "ما" الموصولۃ کو حذف کر دے، اس کے بعد آنے والا نتیجہ (خبر) بھی نکال پھینکے، اور صرف درمیانی حصہ ("ابن حزم نے کہا...") کو لے کر اسی مصنف کے نام سے اپنی دلیل کے طور پر پیش کرے۔ کیا یہ علمی دیانت ہے؟ یا سراسر تحریف اور خیانت؟ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس شخص نے امام شاطبیؒ کے کلام میں بھی ایسا ہی کیا اور ان کی عبارت کو اس طرح بگاڑا کہ گویا فقہِ حنفی کو اُس نے "انجیل" قرار دے کر شریعتِ اسلامیہ کے خلاف ٹھہرا دیا ہو!
اگر یہ غلطی جہالت کی وجہ سے ہوتی حالانکہ وہ ایسا نہیں تو ہم کہتے کہ یہ ایک لغزش ہے اور شاید اس کے بعد وہ شخص سیکھ جائے گا، اور اگر یہ بھول چوک سے ہوتی حالانکہ یہ بھی نہیں، تو ہم تعجب سے کہتے: کیا خوب "بھول" ہے ایسی بھول جو مدعا کے عین مطابق نکل آئی! اب ہم ان محترم حضرات سے سوال کرتے ہیں: اللہ کے نزدیک اس شخص کا کیا حکم ہے جو مصنفین کے الفاظ کو ان کے اصل مفہوم کے الٹ کر پیش کرتا ہے، تاکہ عوام کو دھوکہ دے اور یوں ظاہر کرے کہ اس کے دعوے کی کوئی شرعی بنیاد ہے؟ اور اگر کوئی ایسا کام قرآن و سنت کے نصوص میں کرے نہ کہ صرف فقہی آراء میں تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ یہ سب علم، دیانت اور حق پسندی سے کتنی دوری کی بات ہے! پھر کیسے ممکن ہے کہ کوئی باشعور مسلمان خواہ وہ کوئی بھی ہو ایسے لوگوں کی پیروی کرے جو دین کے مسائل میں اس قدر خیانت کے مرتکب ہوں، اور حدیث و فتویٰ میں اس انداز سے بات کریں؟ میں ان پر کوئی الزام نہیں

مصنفین کا یہ دعوی کہ ہم نے امام ذہبیؒ کے کلام۔۔۔۔

مصنف (یعنی مخالف فریق) نے صفحہ 245 پر یہ اعتراض کیا کہ ہم نے امام ذہبیؒ کے کلام سے چند اقتباسات نقل کیئے، اور ان کے درمیان کا بہت سا متن چھوڑ دیا؛ اور اس کے نزدیک یہی "تحریف میں مہارت" تھی!

ہم تحقیق وتالیف کمیٹی سے عرض کرتے ہیں کہ:

ہم نے امام ذہبیؒ کے اقوال اس لیے نقل کیے تھے تاکہ یہ ثابت ہو کہ کسی مقلد کے لیے کسی خاص فقہی مذہب پر قائم رہنا حرام نہیں ہے۔

امام ذہبیؒ کے جن فقروں کو ہم نے نقل کیا تھا، وہی اصل مقامِ استدلال تھے، ان فقروں میں انہوں نے فقہائے احناف کی تعریف کی، اور ان کے امام ابو حنیفہؒ سے وابستگی کو سراہا، اسی طرح انہوں نے فقہائے شوافع کی مدح کی، اور امام شافعیؒ کے مسلک سے ان کی وابستگی کو درست قرار دیا، یہی بات انہوں نے امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے پیروکاروں کے بارے میں بھی فرمائی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ سب حضرات کسی نہ کسی فقہی مکتب سے وابستہ تھے، اور انہی کے تذکرے سے کتبِ طبقات بھری پڑی ہیں، لیکن یہی وہ بزرگ ہیں جن کے بارے میں اسی تالیفی کمیٹی نے کسی اور جگہ یہ کہا کہ وہ "گمراہ ہو گئے" اور "مومنوں کے راستے سے ہٹ گئے" اور پھر اپنی بات کے ثبوت میں یہ آیت پیش کی:

لگاتا، نہ ہی کوئی سخت لفظ ان کے لیے استعمال کرتا ہوں، لیکن میں صرف ایک سوال اٹھاتا ہوں۔ ایسا سوال جو ہر صاحبِ بصیرت، ایمان دار اور دیانت دار شخص کے دل میں خود بخود پیدا ہوتا ہے، میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں، ان کے داعیوں اور علماء سے پکار کر کہتا ہوں کہ: آئیں! اس سوال کا جواب دیں، اور صاف بتائیں کہ اسلام کا مؤقف ایسے لوگوں کے بارے میں کیا ہونا چاہیے جن کی روش یہ ہے؟ اور ہم منتظر ہیں۔

اگر تم زمین میں رہنے والوں کی اکثریت کی پیروی کروگے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔(الأنعام:116)(ماخوذ از: التعصب المذهبي، ص 111)

جہاں تک امام ذہبیؒ کے باقی کلام کا تعلق ہے جسے ہم نے چھوڑ دیا وہ ان مقلدین کو صرف ناجائز تعصب سے روکتے ہیں، یعنی یہ کہ کوئی اپنے امام کے بارے میں یہ گمان کرے کہ اس کا مذہب تمام مذاہب سے بہتر ہے۔ یہ دراصل کلام کی وضاحت اور توازن ہے، نہ کہ پہلے قول کی تردید۔ ہم بھی اس سے اختلاف نہیں کرتے، بلکہ اس بات کو سبھی تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ ہمارا مقصد صرف اتنا تھا کہ ہم محلِ استشہاد کو بیان کریں وہ حصہ جو بحث سے متعلق تھا اور ہم نے اضافی تفصیل کے بجائے صرف اہم خلاصہ پیش کیا، ہم نے وہی کام نہیں کیا جو اس کمیٹی نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے کلام میں کیا تھا: کہ مبداء اور خبر دونوں کو حذف کر کے صرف جملے کا درمیانی حصہ پیش کر دیا، اور اس طرح مفہوم کو الٹ دیا بالکل دہلویؒ کے ارادے کے خلاف۔

نکتہ نمبر 15: مصنف (یعنی ناقد) نے ہم پر یہ اعتراض بھی کیا کہ ہم نے اپنی کتاب فقہ السیرۃ میں بعض احادیث پر تنقید کی ہے، جن کے بارے میں شیخ ناصر الدین البانی نے تخریج (درجہ بندی) میں غالباً غلطی کی ہے۔ ہماری اصل بات یہ تھی کہ جب کوئی واقعہ ایک ہی دفعہ پیش آیا ہو، اور اس کے متعلق متعدد روایات مختلف اسناد سے مروی ہوں، تو محدث کے لیے مناسب نہیں کہ وہ صرف ایک ضعیف یا حسن سند کو نقل کرے اور صحیح یا زیادہ صحیح سند کو بالکل ذکر نہ کرے، کیونکہ ایسا طرزِ تخریج عام قاری کے لیے غلط فہمی پیدا کر دیتا ہے اور علمائے حدیث ہمیشہ اس سے احتراز کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر: رسول اللہ ﷺ کے مرضِ وفات کے دوران صحابہ کرامؓ کے حضرت ابو بکرؓ کی اقتداء میں نماز پڑھنے والا واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا، اس لیے یہ حدیث حقیقت میں ایک ہی واقعے سے متعلق ہے، لہٰذا مناسب نہ تھا کہ اس کی تخریج میں صرف مسند احمد اور ابن ماجہ کا ذکر کیا جائے، کیونکہ یہ روایت دراصل متفق

علیہ (بخاری و مسلم دونوں) میں موجود ہے، خواہ الفاظ میں معمولی فرق ہو یا سند میں تنوع۔ لہٰذا (البانی) محدث کو چاہیئے کہ تمام روایات کو ذکر کرے، یا کم از کم یوں لکھے:

یہ حدیث متفق علیہ ہے، اور لفظ فلاں محدث کا ہے۔ اسی طرح دوسرا واقعہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، جس میں وہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے وقت آپ کی حالت بیان کرتی ہیں۔ اس حدیث کو بخاری، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ کے سامنے پانی کا ایک پیالہ تھا، آپ اس میں ہاتھ ڈال کر اپنے چہرے پر پھیرتے اور مختلف کلمات فرماتے تھے۔

یہاں روایتوں کے الفاظ میں معمولی فرق پایا جاتا ہے:

بخاری میں ہے:

لا إله إلا الله، إن للموت سكرات"

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک موت کی سختیاں بڑی شدید ہیں۔)

جبکہ ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی نے روایت کیا:

اللهم أعني على غمرات الموت"

(اے اللہ! مجھے موت کی سختیوں پر قابو پانے میں مدد فرما۔)

یا بعض روایات میں ہے: "على سكرات الموت" ہم نے فقہ السیرۃ میں شیخ ناصر کی اس حدیث کو ضعیف قرار دینے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

یہ حدیث صرف اس خاص لفظ کے لحاظ سے ضعیف ہے، لیکن اس کا اصل مضمون بخاری میں صحیح سند سے مروی ہے۔ (فقہ السیرۃ، طبع دوم، ص536)

اور جب ایک ہی واقعہ کی دو مختلف سندیں ہوں، تو مناسب نہیں کہ محدث صرف ضعیف سند کا ذکر کرے اور صحیح سند کو بالکل نظرانداز کر دے، کیونکہ اس سے قاری کے لیے اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ لفظی اختلاف اگر معمولی ہو اور واقعہ ایک ہی ہو، تو اس سے روایت کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تیسری مثال اس کے برعکس ہے۔

یہاں ہم نے اس پر توجہ دلائی کہ بعض احادیث کو ایک ہی واقعہ سمجھ کر جمع کر دیا گیا ہے، حالانکہ وہ دو الگ واقعات ہیں۔ مثلاً روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس باذان (جو یمن میں کسریٰ کا گورنر تھا) کے دو قاصد آئے۔

آپ ﷺ نے ان کے چہروں پر حلاق شدہ رخسار اور مروڑے ہوئے مونچھیں دیکھیں تو آپ نے ان سے منہ پھیر لیا اور فرمایا:

افسوس تم پر ! تمہیں یہ کرنے کا حکم کس نے دیا؟

انہوں نے کہا :

ہمیں ہمارے رب یعنی کسریٰ نے حکم دیا ہے۔

یہ روایت ابن جریر نے بیان کی ہے جبکہ ابن سعد نے یہی واقعہ بیان کیا ہے مگر اس میں مذکور الفاظ (یعنی منہ پھیرنے اور سوال و جواب کا حصہ) ذکر نہیں کیا۔ دوسری جانب، ابن سعد نے ایک اور روایت بیان کی جس میں آیا:

ایک مجوسی نبی ﷺ کے پاس آیا، اس کی مونچھیں لمبی تھیں اور داڑھی کتری ہوئی تھی،

آپ ﷺ نے فرمایا : یہ کس نے تمہیں کرنے کا حکم دیا؟

اس نے کہا :

میرے رب (یعنی آتش پرستوں کا رب) نے۔

آپ ﷺ نے فرمایا : مگر میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں مونچھیں کتروں اور داڑھی بڑھاؤں۔

یہ دوسری روایت پہلی سے بالکل الگ واقعہ ہے، جیسا کہ ہر صاحبِ فہم آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ یہ جو مجوسی شخص تھا، وہ وہی نہیں تھا جو باذان کے دونوں قاصد تھے، جن کے بارے میں ابن سعد نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے، لیکن اُس نے ان کے درمیان ہونے والی اس گفتگو (سوال و جواب) کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

لہٰذا جب دونوں واقعات الگ الگ ہیں تو لازماً دونوں احادیث بھی الگ ہوں گی، اور اس صورت میں ہر حدیث کو اس کے اپنے راوی کی طرف منسوب کرنا ہی درست طریقہ ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہوا کہ شیخ ناصر نے وہاں (پچھلی مثال میں) ایک ہی حدیث کے دو مختلف طریقوں کو علیحدہ علیحدہ سمجھ کر بیان کیا، حالانکہ وہاں جمع کرنا ضروری تھا۔ اور یہاں جہاں دو الگ الگ واقعات اور احادیث تھیں انہیں ایک ہی حدیث سمجھ کر جمع کر دیا حالانکہ یہاں تفریق کرنا لازم تھا، اور ہر روایت کو اس کے اصل راوی سے منسوب کرنا چاہیے تھا۔ درحقیقت ہمارے فقہ السیرۃ میں وہ مقامات جہاں ہم نے شیخ ناصر کی تحقیق پر علمی تنبیہ یا اصلاح کی تعداد میں کافی زیادہ ہیں، مگر لجنۃ التألیف نے ان تمام میں سے صرف انہی تین مثالوں پر جواب دینا مناسب سمجھا۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں،

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہماری ان علمی تنبیہوں اور حسنِ نیت پر مبنی توضیحات کو نہ علمی اصلاح سمجھا گیا، نہ خیر خواہی بلکہ ایک طرح سے اسے طعناً، تحقیر اور استخفاف سے تعبیر کیا گیا۔

حالانکہ ہمارا مقصد نہ کسی کو جاہل قرار دینا تھا، نہ کم علمی پر ملامت کرنا، اور نہ ہی کسی کی علمی وقعت گھٹانا بلکہ ہم نے تو صرف ان معمولی لغزشوں کی نشاندہی کی تھی جو کسی بڑے سے بڑے عالم یا محقق سے بھی ہو سکتی ہیں۔ اصل مصیبت تو یہ ہے کہ:

جب نصیحت قبول کرنے یا تذکیر سننے سے انکار کیا جائے، اور بجائے اس کے عصمت کے دعوے اور غرورِ علمی کے حصار کو ڈھال بنا لیا جائے!

اور اب جہاں تک وہ اعتراض ہے جو انہوں نے ہم پر ہماری کتاب کبریٰ الیقینات کے حوالے سے کیا، یعنی نبی کریم ﷺ کے حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح کے باب میں، تو ہم نے وہاں کسی ضعیف حدیث کو صحیح قرار نہیں دیا بلکہ ایک مشہور تاریخی روایت (جو طبری وغیرہ نے ذکر کی) کا صرف تنقیدی و توضیحی جائزہ پیش کیا۔ (ص188)

یہ روایت کچھ لوگوں کے ذہن میں غلط اور فاسد خیالات پیدا کرنے کا سبب بن گئی تھی لہٰذا ہم نے چاہا کہ واضح کر دیں:

اگر بالفرض یہ روایت درست بھی مانی جائے تب بھی اس سے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے شایانِ شان میں کسی قسم کی کمی یا عیب کا گمان نہیں کیا جا سکتا، اور اسی وضاحت کی مزید تفصیل ہم نے کبریٰ الیقینات کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کی ہے، جو ان شاء اللہ بہت جلد منظرِ عام پر آئے گی۔

رہی بات اس اعتراض کی جو حدیثِ معاذ بن جبلؓ کے حوالے سے کیا گیا، تو ہم نے وہ روایت ابن القیمؒ کی طرح نقل کی، اور ہمیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ بعض اہلِ علم نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

تاہم ہمارا موقف وہی ہے جو ابن القیمؒ اور دیگر محققین کا رہا ہے:

کہ اگر کوئی حدیث علماء کے درمیان قبول عام حاصل کر لے، تو وہ قوت واستناد حاصل کر لیتی ہے خواہ اس کی سند میں کسی درجے کی کمزوری ہی کیوں نہ ہو۔

جیسا کہ تدریب الراوی میں نقل ہے کہ:

اگر کسی حدیث کو اہلِ علم نے قبول کر لیا ہو تو اس کے بارے میں صحیح ہونے کا حکم لگایا جا سکتا ہے، اگرچہ اس کی سند میں کلام ہو۔ اور یہی قول ابن عبد البرؒ اور ابو اسحاق الاسفرائینیؒ سے بھی منقول ہے۔

(تدریب الراوی، ص24، طبع نمنکانی)

اب اگر شیخ ناصر کا اس بارے میں ایک الگ نظریہ ہے، تو انہیں اپنے موقف پر قائم رہنے کا حق ہے لیکن انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ہمیں اپنے فہم یا اجتہاد پر لازماً متبع بنائیں، اور نہ یہ کہ وہ ہمیں اس بات سے روکیں کہ ہم شعبہؒ جیسے محدثین کے لیے رضا و ترحم کے کلمات ادا کریں بالکل اسی طرح جیسے وہ خود ابن تیمیہؒ کے لیے بکثرت اپنی کتاب میں ترحّم و مدح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور پھر میں کوئی سندِ حدیث کا راوی نہیں کہ میرے ترحم کو تدلیس قرار دیا جائے!

اس مناقشے پر مصنفین کا تبصرہ جو میرے اور شیخ ناصر الدین البانی کے درمیان ہوا

مصنفینِ کرام نے اُس علمی گفتگو پر بھی تبصرہ کیا ہے جو میری اور شیخ ناصر کے درمیان اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ہوئی تھی، لیکن صاف کہہ دوں کہ اس تبصرے کی چنداں اہمیت نہیں، نہ ہی اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، البتہ وضاحت کے لیے کہہ دوں کہ اس بحث و گفتگو کی پوری تفصیلات اُن حضرات کو معلوم ہیں جنہوں نے اس کی ریکارڈنگ ابتدا سے انتہا تک سنی ہے، یہ گفتگو میں

نے خود ریکارڈ کی تھی اور شیخ ناصر کی درخواست پر انہیں اس کی ایک نقل بھی دے دی تھی، اب یہ ریکارڈنگ مختلف علاقوں میں بہت سے لوگوں کے پاس موجود ہے اور عام ہو چکی ہے، میں یہاں پھر وہی بات دہراتا ہوں جو میں نے شیخ ناصر کو ایک مکتوب میں لکھی تھی کہ ۔ مجھے اس گفتگو کے مکمل طور پر شائع کیے جانے پر کوئی اعتراض نہیں، بشر طیکہ ایک لفظ تک میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ اور جہاں تک اُن تلخ جملوں، گالیوں اور سخت الفاظ کا تعلق ہے جو اُن کے جواب میں لکھے گئے کتاب کے بنیادی حصے کی حیثیت رکھتے ہیں، تو میں اس موقع پر اپنے دل کی گہرائیوں سے ایک بات کہتا ہوں کہ :

اللہ جانتا ہے کہ میں یہ الفاظ دکھاوے کے طور پر نہیں کہہ رہا۔ اگر واقعی میں ان گالیوں اور ملامتوں کا مستحق ہوں تو میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے درست راستہ دکھائے، میری اصلاح فرمائے اور سیدھے راستے پر گامزن کرے، اور اگر میں ان کا مستحق نہیں، تو میں اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ ان لوگوں کو معاف فرمائے، انہیں ان الفاظ کا کوئی بوجھ نہ دے، اور میرے دل میں بھی اُن کے لیے کوئی کینہ یا بغض نہ رکھے آخر وہ بھی تو میرے ہی بھائی ہیں، جنہیں ایمان باللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نسبت نے مجھ سے جوڑ رکھا ہے۔ کتاب کے اختتام پر مصنفین نے مجھے ایک نصیحت کی ہے :

کہ میں پانچ سال تک لکھنے اور تصنیف سے باز رہوں۔ میں خود سے سوال کرتا ہوں :

آخر وہ کون سی چیز ہے جو مجھے آج بھی لکھنے اور تصنیف پر آمادہ رکھے ہوئے ہے؟ نہ تو میں شہرت کا طالب ہوں، کہ وہ تو مجھے میری توقع سے کہیں زیادہ مل چکی ہے، نہ مال و دولت کی حاجت ہے، کہ اللہ نے ضرورت سے بڑھ کر عطا فرمایا ہے، اور نہ ہی اب لوگوں کی تعریف و تمجید میں کوئی لذت باقی ہے، کیونکہ آخر کار میں نے سمجھ لیا کہ اس کا کوئی حقیقی فائدہ نہیں سوائے اس کے کہ کسی مخلص مسلمان بھائی کی دعا میرے حق میں غیب سے پہنچ جائے، در حقیقت، جو چیز مجھے آج بھی لکھنے اور دعوت کے میدان میں قائم رکھے ہوئے

ہے، وہ قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے، جسے میں اکثر دہراتا ہوں اور اس پر غور کرتا رہتا ہوں، اور اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ میری کوتاہیوں کے باوجود مجھے بھی اُس کے اہل لوگوں کے ساتھ شامل فرمادے۔

وہ آیت یہ ہے:

اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے، نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ (سورۃ فصّلت: 33)

لہٰذا میں یہی تمنا رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان داعیانِ حق میں شمار فرمائے، اگرچہ میں ان کے مقام و مرتبہ کے لائق نہیں، اور اپنی رحمت سے مجھے اُن کے اجر و ثواب میں شریک فرمادے، خواہ میں ان کے برابر نہ ہوں۔ تاہم، اس کے باوجود، اگر کوئی ایسا صادق عالمِ دین جس کے علم، دیانت اور اخلاص پر مجھے اعتماد ہو، مجھے اس بارے میں فتویٰ دے کہ میں فی الحال لکھنے سے رک جاؤں، تو میں بلا تردد ایسا کر لوں گا، کیونکہ کبھی کبھی خاموشی بولنے سے بہتر ہوتی ہے، اگرچہ انسان خود اس حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے۔

آخر میں، میں اُس محترم شخص سے بھی معذرت خواہ ہوں جس کے نام پر مصنفین نے اپنی کتاب منسوب کر دی ہے، اگر میں نے اس کا ذکر کسی رد یا گفتگو میں نہیں کیا، تو اس کی وجہ یہی ہے کہ مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت یا موقع نظر نہیں آیا۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

(صبح پانچ بج کر انیس منٹ پر ترجمہ مکمل کیا، اس وقت فجر کی آذان کی آواز کانوں میں آرہی ہے الحمد للہ)